معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے　　فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　　ہوائی ڈاک　　بیس پونڈ　　یا　　بتیس ڈالر

بحری ڈاک　　سات پونڈ　　یا　　گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۷ ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۶ء عدد ۵

فہرست مضامین

شذرات

قارئین کو یہ شمارہ جس وقت موصول ہوگا اس وقت ملک میں ہونے والے انتخابات کے نتائج سامنے آچکے ہوں گے۔ اس انتخاب کا غلغلہ بلند ہوتے ہی سیاست دانوں میں دل بدلی کا طوفان آگیا تھا، جس کو اپنی پارٹی کا ٹکٹ نہیں ملا یا جس کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہوا اس نے اپنی اس پارٹی کو جس کے وہ کل تک گن گا رہا تھا، بے تکلف چھوڑ دیا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان دل بدلی کرنے والوں کے لئے دوسری پارٹیوں نے اپنے دروازے کھول دئے، ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور ان کی حوصلہ افزائی کے لئے انہیں اعزاز و اکرام بھی بخشا اور اپنی پارٹی کے قدیم اور وفادار کارکنوں کو نظر انداز کر کے ایسے ہی بے اصول اور موقع پرست اشخاص کو پارٹی ٹکٹ دیا۔ جو لوگ معیار و اقدار کی باتیں کرتے ہیں اور اصول، اخلاق اور قانون کی بالادستی کے بلند بانگ دعوے کرتے ہیں ان کی جبینوں پر بھی اس صریح بے اصولی سے کوئی شکن نہیں آئی بلکہ وہ خوشی و مسرت سے جھوم اٹھے اور اس زریں موقع سے اچھی طرح فائدہ اٹھایا۔ وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے بڑے فخر سے کہا۔ ہماری پارٹی کو چھوڑنے والوں کے مقابلے میں اس میں شامل ہونے والوں کی تعداد زیادہ رہی۔

دوسری طرف رائے دہندگان نے بھی ایسے مفاد پسند اور موقع پرست لوگوں پر برہمی اور ناراضگی ظاہر کرنے اور ان سے باز پرس اور احتساب کرنے کے بجائے ان کی ہمت و حوصلہ بڑھایا اور ووٹوں کا نذرانہ پیش کر کے انہیں کامیاب بنانے میں سرگرمی دکھائی۔ حد یہ ہے کہ بدعنوانی میں ملوث، حوالہ کیس اور ٹاڈا میں ماخوذ سیاست دانوں سے بھی ووٹروں نے بڑی گرم جوشی اور ہمدردی کا مظاہرہ کیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ سیاست داں اور عوام مل کر بدعنوانی اور بے اصولی کو فروغ اور قانون کی بالادستی کو ختم کر رہے ہیں، بے کردار اور جرائم پیشہ لوگوں کا بول بالا کرنے میں بھی دونوں طبقے شریک ہیں، انہیں امیدوار بنانے میں کسی پارٹی نے بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کی، اہل و لائق اور صاحب کردار لوگوں کو نظر انداز کر کے ایسے لوگوں کو امیدوار بنانا ایک عام وطیرہ ہو گیا ہے جو تشدد، دہشت گردی اور قتل و غارت گری کے لئے اپنے اپنے حلقوں میں بدنام ہیں تاکہ وہ اپنی مجرمانہ حرکتوں اور زور زبردستی سے لوگوں کو ڈرا دھمکا کر زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کریں اور بوتھوں اور پولنگ اسٹیشنوں پر قبضہ کر لیں، فلمی ہیروز اور غلط اور ناجائز کاروبار کرنے والوں کو ٹکٹ دئے گئے تاکہ نوجوانوں میں ان کی مقبولیت اور سرمایے سے الکشن میں کامیابی حاصل کی جائے، کسی ملک اور قوم کی

اس سے بڑھ کر بدنصیبی اور بدبختی کیا ہو سکتی ہے کہ اہل، ایمان دار، مدبر، دانشور اور تعلیم یافتہ طبقہ کو گوشوں اور کونوں میں پناہ لینے کے لئے مجبور ہونا پڑے اور جرائم پیشہ اور سماج دشمن عناصر تخت و تاج کے مالک بن کر ہر قسم کی بے راہ روی اور بدعنوانی کو فروغ دینے لگیں۔

گو اس دفعہ انتخابی مہم میں وہ شور و غوغا نہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، تشدد کے واقعات بھی کم ہوتے، نہ پوسٹر اور بینرز کی بھرمار اور نہ جلسے جلوس کی بہار آتے دن دکھائی دی، گیارہویں لوک سبھا کے انتخابات کا یہ قدرے پرسکون ماحول چیف الکشن کمیشن ٹی۔ این۔ سیشن کی دین ہے جو سیاست کو بدعنوانی سے پاک کرنا چاہتے ہیں، ان کے اس نیک جذبہ کی قدر کی جانی چاہئے اور دعا کرنی چاہئے کہ آئندہ مزید اصلاحات ہوں۔ مگر اس کے باوجود اس انتخاب پر ذات پات کی سیاست اور علاقائیت چھائی رہی، مذہب کا غلط استعمال کیا گیا، ذات کے نام پر ڈاکوؤں اور قاتلوں کو ٹکٹ دئے گئے اور ووٹروں نے انہی کو شریف اور اچھے امیدواروں پر ترجیح دیا، معیار اور اقدار کی بات کرنے والی اور اصول پسندی کا دعویٰ کرنے والی جماعت کا بھرم پہلے ہی کھل چکا ہے اور اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ محض اقتدار کے لئے مذہبی جذبات اور فرقہ وارانہ کے شعلے بھڑکا کر یہ مذہب کے نام پر ووٹ مانگتی ہے۔ ووٹ پڑنے کے دن بھی جس کو جہاں موقع ملا اس نے تشدد اور نفرت کو ہوا دی، بوتھوں اور پولنگ اسٹیشنوں پر قبضے کئے، ووٹروں کو ڈرا دھمکا کر ووٹ دینے سے روکا گیا، بوگس ووٹ دینے دلانے کا کام بھی ہوا، الکشن کمیشن کی کوشش کے باوجود ایمان دارانہ اور صاف ستھرے الکشن نہ ہونے کے ذمہ دار عوام اور سیاست داں دونوں ہیں، بگڑے ہوئے ذہنوں کو تبدیل کر دینا الکشن کمیشن کے بس میں نہیں؛ یہ خدا بیزار سیاست کے برگ و بار ہیں جو پورے ملک پر چھا جانا اور اسے تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں:

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پہلے ہی سے کہا جا رہا تھا کہ اس دفعہ انتخابات میں کسی سیاسی پارٹی کو فیصلہ کن اکثریت حاصل نہیں ہوگی البتہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو سب سے زیادہ سیٹیں ملیں گی، ان سطور کی تحریر کے وقت جو نتائج موصول ہوتے ہیں ان سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سیاسی جوڑ توڑ، پارٹیوں میں ٹوٹ پھوٹ اور ممبران کی خرید و فروخت ہونے لگے گی، علاقائی

پارٹیوں سے سودے ہوں گے اور آزاد امیدواروں کی قسمت چمک اٹھے گی، کرپشن اور بدعنوانی
ہموار ہو جائے گا اور ایسی غیر مستحکم حکومت وجود میں آئے گی جس کا آشیانہ شاخ نازک پر ہوگا جو
معمولی جھونکے سے زمیں بوس ہو جائے گا، ذات پات کی عصبیت کو فروغ دینے، فرقہ وارانہ
بھڑکانے اور مذہبی منافرت پھیلانے والی بھارتیہ جنتا پارٹی کا سب سے بڑی پارٹی کی شکل میں
ہونا ملک کی بڑی بد قسمتی ہے جس کے کالے کرتوت سے اس ملک کی رسوائی پوری دنیا میں
ہے، لیکن اس کو اکثریت میں لانے اور اونچا اٹھانے کی ذمہ داری ان سیکولر پارٹیوں اور
لیڈروں پر ہے جن کی ضد، ہٹ دھرمی، انانیت اور اقتدار کی ہوس نے انہیں متحد نہیں ہونے
اترپردیش میں بھارتیہ جنتا پارٹی کو کامیابی اسی دن مل گئی تھی جب اس نے سماج وادی اور
سماج پارٹی میں تفریق پیدا کر دی تھی، جنتا دل کی انتہائی کوشش کے باوجود یہ دونوں پارٹیاں
چناؤ لڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئیں، ان کی اس اکڑ فوں کا فائدہ بھی بھارتیہ جنتا پارٹی کو ملا
آندھرا پردیش میں تلگو دیشم کی تقسیم سے کانگریس کو فائدہ پہنچا، اگر ناک کے اونچا رہنے کا سوال
تو اس وقت تیسرا محاذ حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہوتا۔ مگر جن لوگوں سے آزادی، جمہوریت
ملک کے سیکولر کردار کے تحفظ کی امیدیں تھیں انہی کی ناعاقبت اندیشی نے یہ برا دن دکھایا ہے۔

مولانا آزاد اکیڈمی، دہلی کے جنرل سکریٹری مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی نے مسلم آثار
خصوصاً ہندوستان کی تاریخی اور یادگار مسجدوں کی مستند تحقیق مرتب کرنے کا پروگرام بنایا ہے،
سلسلہ کی پہلی جلد "دہلی کی تاریخی مساجد حصہ اول" شائع ہو چکی ہے، جس کا تعارف اسی اشاعت
کرایا گیا ہے، جلد ہی اس کا دوسرا حصہ بھی مکمل ہو جائے گا، جس کے بعد وہ مختلف صوبوں کی
مساجد پر کام شروع کرنے والے ہیں، اہل علم کو چاہئے کہ اپنے اپنے علاقوں کی تاریخی مساجد کی
اور ان کے بارے میں مستند حوالوں سے صحیح معلومات مصنف کو بہم پہنچائیں تاکہ یہ مفید سلسلہ
تکمیل کو پہنچے اور مساجد کے تحفظ و بقا کا سامان ہو جائے۔

دارالمصنفین کے بعض مخطوطات کو ایڈٹ کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے، اگر کوئی
یہ خدمت انجام دینا چاہیں تو دارالمصنفین کو مطلع فرمائیں۔ وہ سید جمال الدین افغانی پر بھی ایک
اور باقاعدہ کتب مرتب کر کے شائع کرنا چاہتا ہے، جو صاحب علم یہ کام کرنا چاہیں وہ بھی مراسلت
زحمت گوارہ فرمائیں؛

مقالات

حضرت میر سید محمد بن امیر کبیر سید علی الہمدانیؒ

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری۔ کشمیر

مبلغ اسلام حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی ہمہ جہت شخصیت کا ایک لازمی جزء ان کے فرزند گرامی میر سید محمد ہمدانیؒ بھی تھے جنھوں نے کشمیر میں اپنے والد بزرگوار کی تبلیغی اور اصلاحی خدمات کو پایۂ تکمیل تک پہونچا کر اپنی سعادتمندی کا ثبوت دیا تھا۔ ان کی تبلیغی مساعی کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر کبیرؒ کے جملہ رفقاء اور مریدین میں سے صرف ان کے یہی عالی قدر فرزند وہ مطلوبہ صلاحیت رکھتے تھے جس سے وہ خلا پُر ہو سکا جو ان کے والد بزرگوار کے اچانک انتقال فرمانے کے نتیجے میں کشمیر میں تبلیغ و اصلاح کی فضا پر پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے جتنی بھی مدت کشمیر میں قیام فرمایا اس میں وہ بے حد مصروف رہے اور کارہائے نمایاں انجام دیے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ انہی کی انتھک محنت سے ان کے جلیل القدر والد بزرگوار کی تبلیغی کوششیں نہ صرف بارآور ثابت ہوئیں بلکہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو کر کسی بھی باد مخالف کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئیں۔

ولادت حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ نے چالیسؔ سال کی عمر میں نکاح کیا تھا اس طرح ان کی تاریخ ولادت مد نظر رکھتے ہوئے یہ نکاح کم و بیش ۷۵۲ھ میں ہوا تھا۔

کئی سال بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک فرزند عطا کیا جو تاریخ میں میر سید محمد ہمدانیؒ
کے نام سے مشہور ہوئے۔ خلاصۃ المناقب کے مولف نے لکھا ہے کہ ایک دن حضرت
امیرؒ نے حاضرینِ مجلس کو اپنا ایک خواب بیان کیا، فرمایا کہ: حضرت شیخ محمود مزدقانیؒ
نے مجھے ایک باز عنایت فرمایا اور کہا کہ اسے حضرت حق نے تیرے لیے انعام کے
طور پر بھیج دیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے اسے کیا کرنا ہے؟ فرمایا: "جاکر اسے خانقاہ
میں رکھو۔" اس کے ساتھ ہی میں نے حضرت شیخ مزدقانیؒ کے پیچھے نظر دوڑائی تو دیکھتا
ہوں کہ حد نظر تک اولیاء اللہ کا ایک کارواں ہے جو اس خدائی بخشش (باز) کی
تکریم کی حالت میں ہے۔ چنانچہ میں نے اس خواب سے اس حقیقت کی جانب
اشارہ پایا کہ مجھے ایک فرزند صالح عطا ہونے والا ہے۔[1]

میر سید محمد ہمدانیؒ کی تاریخ ولادت کسی بھی تذکرہ میں موجود نہیں ہے، البتہ
تذکرہ نگاروں نے ان کے والد بزرگوار کے حالات میں یہ تصریح کی ہے کہ انکے
انتقال کے وقت سید محمد ہمدانیؒ کی عمر بارہ برس کی تھی۔ اس طرح حضرت امیرؒ کی
تاریخ وفات ملحوظ رکھتے ہوئے میر سید محمد ہمدانیؒ کا سال ولادت ۷۷۴ھ سے
۷۷۶ھ کے درمیان ٹھہرتا ہے۔

والد بزرگوار کی وصیت چونکہ حضرت امیرؒ کی عمر کا ایک بڑا حصہ سفر و سیاحت
میں گزرا تھا اور انتقال کے وقت بھی وہ سفر ہی کی حالت میں تھے اس لیے غالب
گمان یہی ہے کہ سید محمد ہمدانیؒ کی تعلیم و تربیت ان کے والد بزرگوار کے صاحب علم
رفقاء اور مریدین کے پہلو میں ہی ہوتی تھی۔ اس کی تائید ان دو تحریروں سے بھی

[1] خلاصۃ المناقب: مرتبہ ملا نور الدین بدخشی۔

ہوتی ہے جو امیر کبیرؒ کی سیرت و سوانح کی کتابوں میں موجود ہیں۔ تفصیل اس طرح
نقل کی جاتی ہے۔

سید محمد ہمدانیؒ کی عمر بارہ برس کے قریب تھی کہ ان کے والد بزرگوار امیر کبیر
سید علی ہمدانی کو اچانک آخرت کی طرف سے بلاوا آیا۔ یہ جانکاہ حادثہ اسوقت
پیش آیا جب حضرت امیرؒ بنیر کے مقام سے حج بیت اللہ کی نیت سے روانہ
ہوئے جب ایک سرحدی بستی قریہ علی شاہ پہنچے تو والی ریاست حضرت شاہ
نے انہیں اپنے یہاں چند دن قیام فرمانے کی درخواست کی۔ یہاں آپ کی صحت
اچانک بگڑ گئی اور آپ نے اپنے رفقائے سفر سے علٰحدگی اختیار فرمائی۔ اس دوران
ذوالحجہ کا مہینہ بھی شروع ہوا اور آپ جانبر نہ ہوسکے۔ چنانچہ آپ نے ۶ ذوالحجہ
کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ شیخ عبدالوہاب نوریؒ (کشمیر میں مشائخ کبرویہ کے مشہور
سوانح نگار) کے مطابق اسی بیماری کی حالت میں حضرت امیر کبیرؒ نے اپنے کم عمر
فرزند کے نام دو تحریریں ـــ وصیت نامہ اور خط ارشاد ـــ لکھوا کر اپنے ایک
خاص رفیق سفر مولانا محمد سرائے کے حوالہ کر دیں اور وصیت فرمائی کہ وہ ان
دونوں تحریروں کو مولانا اسحٰق ختلانیؒ اور مولانا نور الدین جعفر بدخشیؒ کے حوالہ
کر دیں گے۔[1] یہ دو بزرگ حضرت امیرؒ کے سب سے زیادہ قابل اعتماد مریدین
میں سے تھے۔ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیرؒ نے اپنے فرزند کی
تعلیم و تربیت کے لیے ان دو بزرگوں کو صراحتاً نامزد کیا تھا۔ شیخ محمد اشرف
فنکدلی مرحوم نے مولانا اسحٰق ختلانی کے بارے میں لکھا ہے:

[1] نفحات کبرویہ۔

جناب سیادت فرزند ارشد خود
سید محمد ہمدانیؒ با ایشاں حوالہ
نمودند و بموجب آں دو سال در
خدمت ایشاں گزرانیدہ[1]

حضرت امیرؒ نے اپنے فرزند سید محمد ہمدانیؒ کو انہی کے حوالے کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے سید محمد ہمدانیؒ نے سید محمد اسحٰقؒ کی خدمت میں دو سال گزارے تھے۔

جہاں تک مولانا نورالدین بدخشیؒ کا تعلق ہے تو وہ کچھ اپنے نمایاں علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی بنا پر اور کچھ حضرت امیرؒ کے ساتھ گہری وابستگی اور عقیدت کی وجہ سے علمی اور روحانی حلقوں کے ساتھ ساتھ کشمیر کے ایوانِ حکومت میں بھی بڑے رتبے اور مقام کے مالک تھے۔ جب تیمور لنگ دہلی پر قابض ہوکر جموں سے گزرا تو سلطان سکندر شاہ کشمیری نے خیر سگالی کا ایک وفد انہی مولانا نورالدین کی سربراہی میں جموں روانہ کیا تھا۔ تیمور نے مولانا اور ارکانِ وفد کی عزت و تکریم کی تھی۔ اس طرح کشمیر تیموری طوفان کی زد میں آنے سے محفوظ رہا تھا۔ تقریباً تمام معتمد مورخین نے اس وفد اور مولانا کی قیادت کا ذکر کیا ہے۔ جن میں یزدی اور خواند امیر بھی شامل ہیں۔

شیخ عبدالوہابؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت امیرؒ اپنے فرزند کے حسن استعداد اور فطری صلاحیتوں سے پُرامید تھے: "آنحضرت را نظر بر حسن استعداد ایشاں بودہ[2]" یہی وجہ ہے کہ انہوں نے وصیت نامہ اور خط ارشاد ان کے نام لکھوا کر انہیں ختلان میں سپرد کرنے کی تاکید کی تھی۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ گو وصیت نامہ

---

[1] تحفۂ اشرفیہ: ابو محمد حسن، لاہور ۱۳۵۲ھ ص ۵ [2] نفحات کبرویہ (قلمی)

فوراً سونپا گیا مگر خط ارشاد یا خلافت نامہ دو سال کی ریاضت شاقہ اور مراحلِ سلوک طے کرنے کے بعد ہی عطا کیا گیا۔ اس کی تفصیل مورخ حسن نے اس طرح بیان کی ہے:

"حضرت خواجہ اسحٰق ختلانیؒ نے صرف وصیت نامہ ان کے حوالے کر دیا اور کہا کہ دوسری تحریر اسی وقت دی جاسکتی ہے جب سالک خادمیت سے گزر کر مرتبۂ مخدومیت پر فائز ہو جائے۔ چونکہ وہ وقت ابھی نہیں آیا ہے اس لیے مناسب موقع پر ہی اسے حوالہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ سن کر حضرت میر سید محمد ہمدانی کا حال بدل گیا، انہوں نے سجادہ نشینی چھوڑ دی اور ختلانی کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے۔ وہ قریباً ساڑھے تین سال تک ان کی خانقاہ میں رہے۔ یہاں وہ معمول کے اوراد و وظائف کے ساتھ ساتھ خانقاہ نشینوں کے کلوخ اور پانی کا انتظام بھی کرتے تھے۔ ساتھ ساتھ مولانا نورالدین بدخشیؒ سے بھی طریقت کے آداب حاصل کرتے تھے۔ جب سولہ برس کی عمر کو پہنچے تو خلافت نامہ انکے حوالے کیا گیا[1]"

کشمیر تشریف آوری

حضرت سید محمد ہمدانیؒ اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے دس سال بعد کشمیر وارد ہوئے۔ اگرچہ حضرت امیرؒ نے اپنے وصیت نامے میں سیاحت کے لیے کسی خاص مقام کا ذکر نہیں کیا ہے مگر دین کی راہ میں سفر و سیاحت اختیار کرنے کی زوردار الفاظ میں تاکید کی ہے۔ اس کے ظاہری اور باطنی فوائد کو نمایاں کر کے اطراف واکناف کے علماء اور مشائخ سے مستفید ہونے کی

---

[1] تاریخ حسن ج ۳ ذکر "میر سید محمد ہمدانی"

ہدایت فرمائی ہے، سفر پہ آمادہ کرتے ہوئے خود اپنا تجربہ بطور تحدیث نعمت ان
الفاظ میں بیان کیا ہے:

من تا سیاح نشدم علی ہمدانی نہ گشتم	جب تک میں نے سیاحت نہیں کی
قبض و فتوح کہ مرا حاصل شد از سفر	تب تک علی ہمدانی نہیں بن سکا۔
شد.... علی ہمدانی سفر بکشید بدولت	صرف سفر کی برکت سے ہی مجھے
رسید[1]	روحانی مراتب حاصل ہوئے علی ہمدانی
	نے سفر کی مشقت اٹھا کر ہی باطنی
	دولت حاصل کی۔

اس تائید کے باوجود میر سید محمد ہمدانیؒ کو پورے دس برس تک سفر اسلام
بننے کے لیے تیاری کرنی پڑی۔ انہوں نے غالباً اس کی ابتدا کشمیر سے کی تھی۔ کیونکہ
ان کے والد بزرگوار کو کشمیر میں تبلیغ و اشاعت اسلام کے محاذ پر جو محیر العقول
کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کا ذکر خیر ہر طرف سنائی دیتا تھا عقل عام بھی یہی
کہتی ہے کہ حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ کی یہ سب سے بڑی منصبی ذمہ داری تھی کہ
وہ اس درخت کی پرورش اور نگہداری کی طرف پہلی فرصت میں توجہ کریں جس کو
ان کے والد بزرگوار نے وادی کے قلب میں لگانے میں کامیابی حاصل کی تھی
اور جو پُرثمر ہونے کے باوجود اب بھی معرض خطر میں آسکتا تھا۔ چنانچہ وہ اس
مقصد کے لیے ۷۸۱ھ میں وسط ایشیائی ممالک سے تعلق رکھنے والے تین سو علماء
اور سادات مبلغین پر مشتمل جماعت کی سربراہی کرتے ہوئے وادی کشمیر میں داخل

[1] فتحات کبرویہ (قلمی)

ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر ۲۲ برس تھی۔ رسالۂ اسکندریہ میں انہوں نے صراحت
کی ہے کہ اس کی تالیف کے وقت وہ صرف ۲۲ برس کی عمر کے تھے۔

"در رسالۂ اسکندریہ برائے سلطان تالیف نمود و در آں تصریح نمود کہ در آں
وقت در سن بیست و دو سال بود"[1]

یہ زمانہ سلطان قطب الدین (۷۸۰ھ تا ۷۹۶ھ) کے بیٹے سلطان سکندر
شاہ کشمیری کا عہد حکومت تھا۔ کشمیر میں سید محمد ہمدانیؒ اور ان کے رفقاء کا والہانہ
طریقے پر استقبال کیا گیا۔ خوش آمدید کہنے والوں میں سلطان سکندر خود بھی شامل
تھا۔ محدث مشکوتی لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے غیر مسلم وزیر اعظم سہ بٹ کو استقبال
کرنے کے لیے روانہ کیا وہ پہلی ہی ملاقات میں اس حد تک مسحور ہوا کہ نہ صرف
اسلام قبول کیا بلکہ اپنی بیٹی کا نکاح بھی ان سے کیا۔ اب یہی وزیر سہ بٹ ملک
سیف الدین کے لقب سے مشہور ہوئے[2]۔ نیز یہ زمانہ کشمیری ریشیت کے
عروج کا تھا۔ اس عہد میں درویشوں کی اس جماعت کے سرخیل حضرت شیخ
نور الدین ریشیؒ تھے۔ اگرچہ اس وقت ان کی عمر بڑھاپے کی حد کو چھو رہی تھی تاہم
وہ بھی اس جوان سال پردیسی مبلغ کا استقبال کرنے والوں میں پیش پیش رہے
اور کچھ ہی دنوں کے بعد ان کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کر کے سلسلہ کبرویہ ہمدانیہ
سے منسلک ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ اس وقت میر سید محمد ہمدانیؒ کی عمر ۲۲ برس سے زیادہ
نہیں تھی مگر ان کی شخصیت نہایت پرکشش اور اپنے جملہ رفقاء میں نمایاں تھی۔

[1] اسرار الابرار (قلمی) داؤد مشکوتی محدث تذکرہ "میر سید محمد ہمدانی" [2] ایضاً

اس عہد کا کشمیری مورخ جونراج اپنے سخت مذہبی تعصب اور کشمیر کے مہاجر مسلمانوں کے تئیں شدید بغض و منافرت رکھنے کے باوجود بھی سید محمد ہمدانیؒ کی شخصیت کی دلآویزی کی حقیقت کو چھپا نہیں سکا۔ وہ لکھتا ہے:

AS THE BRIGHT MOON IS AMONG THE MASS SO WAS MOHAMMADA OF MERA COUNTRY AMONG THE YAVANAS[1],

مسلمان ملک سے آئے ہوئے محمد دوسرے پردیسیوں میں ایسے ہی نمایاں ہیں جیسے تاروں میں چاند۔

تبلیغی خدمات کشمیر وارد ہونے پر سید محمد ہمدانی کا جس جوش و عقیدت سے استقبال کیا گیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر مدت مدید سے کسی کھوئے ہوئے مخدوم کی بازیابی کا منتظر تھا۔ ان کی عام مقبولیت اور احترام کا حال دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ چاہتے تو یہاں کے سیاسی اقتدار کے بھی حصہ دار بن سکتے تھے مگر جس طرح ان کے والد بزرگوار نے اس میدان میں کمال بے نیازی کا ثبوت دیا تھا اسی طرح ان کے لائق فرزند نے بھی اپنی سرگرمیاں صرف تبلیغ دین، تربیت باطن اور اصلاح معاشرہ تک محدود رکھیں۔ ہر چند وہ وزیر اعظم کشمیر کے داماد اور سلطان وقت کے مشیر و مخدوم تھے تاہم سیاسی معاملات میں انہوں نے کبھی بیجا مداخلت نہیں کی اور نہ ان تعلقات کا استحصال کیا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے

---

[1] KINGS OF KASHMIR, ENG TR: MR J. C. DUTT, VIII, P. 57.

مسلمانوں کے چند اجتماعی مراکز کی تعمیر و تجدید کا سلسلہ شروع کیا تو قواعد و ضوابط کے مطابق خزانۂ عامرہ میں ان کی قیمت بھی ادا کرتے رہے۔

حضرت میر سید محمد ہمدانیؒ نے اپنے سینکڑوں رفقاء کو کشمیر کے چپے چپے پر دین حق پہنچانے اور اسلامی تعلیمات شائع کرنے پر مقرر کیا۔ انہوں نے اپنی خاص نگرانی میں کشمیر کی کئی تاریخی مساجد اور خانقاہوں کی تعمیر کرائی، اسی طرح اپنے مریدین اور رفقاء کے ذریعہ بھی وادی کے طول و عرض میں مسجدوں، خانقاہوں، مدارس، حماموں، غسل خانوں، مسافر خانوں، مقبروں اور عیدگاہوں کا جال بچھا دیا۔ جس نے کشمیر کے اسلامی انقلاب کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ سرینگر کے وسیع و عریض میدان عید کے بارے میں مورخ حسن لکھتے ہیں:

"عیدگاہ میدانیست وقف کردۂ میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ"[1]

اسی طرح سرینگر ہی کے لق و دق اسلامی قبرستان کے بارے میں یہی مورخ رقمطراز ہیں:

"میدانیست میل در میل وقف کردہ میر محمد ہمدانی و بابا اسماعیل زاہد کہ آنرا ملہ کھاہ گویند"[2]

آگے مورخ مرحوم اس تاریخی مقبرے کے بارے میں یہ اطلاع بھی دیتے ہیں:

"مزار مردم شہر و مدفن اولیاء دہر دراں جاست"[3]

اس مقبرے میں لاکھوں مسلمان اور ان گنت اولیائے کرام محو خواب ابدی ہیں۔ شاید اسی مقبرے کو دیکھ کر کشمیر کے ایک قدیم غیر مسلم مورخ نے

---

[1] تاریخ حسن ج ۱ ص ۲۴۶ [2] ایضاً: ص ۲۴۷ [3] ایضاً۔

بھانپ لیا تھا کہ اب جہلم کا رخ موڑنا کسی کے بس کا روگ نہیں ہے مگر آج ہمارے ہی ہاتھوں اس تاریخی مقام کی جو حالت بن گئی ہے وہ خوفناک عبرت کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اسی طرح سرینگر کے عین وسط میں جو تاریخی جامع مسجد موجود ہے اسکے اولین بانی میر سید محمد ہمدانی اور اولین معمار خواجہ صدر الدین خراسانی تھے[1]

اسلامی آثار ہی کے سلسلے میں سرینگر کی "خانقاہ معلی" تاریخی اہمیت کی حامل ایک شاندار یادگار ہے۔ دریائے جہلم کے کنارے پر یہ ایک کھلی جگہ تھی جہاں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی کشمیر وارد ہونے کے وقت ٹھہرے تھے، یہیں نماز ادا کرکے دعوت دین بھی دیتے تھے۔ وادی کے غیر مسلم باشندے اسی جگہ جوق در جوق پہنچ کر اس درویش خدامست کے ہاتھ پر اسلام کے دائرے میں داخل ہوتے تھے۔ یہ جگہ حضرت میر سید محمد ہمدانی کی تشریف آوری تک کسی مستقل تعمیر سے خالی تھی۔ جامع مسجد کی تعمیر کے بعد انہوں نے اپنے والد بزرگوار کے اس مستقر پر خانقاہ تعمیر کرنے کا ارادہ کیا جس کے لیے حکومت وقت سے قاعدے کے مطابق اجازت لی گئی اور اس کے مصارف پر ایک بدخشانی ہیرا خزانۂ شاہی میں داخل کیا گیا، جس کا مفصل ذکر اس تاریخی قبالے میں موجود ہے جو خانقاہ کی تعمیر کے سلسلے میں سلطان سکندر شاہ اور میر سید محمد ہمدانی کے درمیان قلمبند ہوا تھا اور جس کے ایک ایک لفظ سے طرفین کے اخلاص کی بے پایانی، ایمان و یقین کی وافر دولت اور مذہبی حمیت وغیرہ سے سرشار ہونے کی کیفیت کا تھوڑا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں سکندر شاہ بجائے

[1] اسرار الابرار (قلمی)

بادشاہ تقوی و پرہیزگاری کا پیکر، درویش اور میر سید محمد ہمدانی ایک نہایت بالغ نظر دور اندیش اور سیاست آشنا عالم باعمل مبلغ دین نظر آتے ہیں۔ اسی دستاویز سے اس جانب بھی اشارہ ملتا ہے کہ امیر سید علی ہمدانی کو اس خاص جگہ پر قیام کرنے کی طرف عالم غیب سے اشارہ ملا تھا۔ میر سید محمد ہمدانی لکھتے ہیں:

"بر صفہ کہ والد بزرگوار حسب فرمودۂ جد عالیمقدار بنا نمود[1]۔۔۔۔"

"جد عالیمقدار" سے یہاں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ مراد ہے۔ کیونکہ حضرت امیرؒ کا نجیب الطرفین سید ہونا ایک مسلمہ تاریخی حقیقت ہے۔ تذکرہ اور تراجم کی کتابوں میں ان کا شجرۂ نسب شروع سے محفوظ اور موجود ملتا ہے۔

کشمیر کے مذہبی مقامات میں درگاہ حضرت بل کے بعد اسی خانقاہ کو سب سے بڑی اہمیت حاصل ہے، بلکہ قدامت کے اعتبار سے یہ خانقاہ حضرت بل درگاہ سے چار سو سال قبل وجود میں آئی ہے، بلا مبالغہ آج تک کروڑوں مسلمانوں نے اس مقدس مقام پر اللہ تعالی کے حضور جبہ سائی کرکے توحید کا زمزمہ جاری و ساری رکھا ہے۔ وقت کے نازک ترین موڑوں پر اسی جگہ بیٹھ کر ذکر و اوراد کا شغل رکھنے والوں نے مردہ رگوں میں تازہ روح دوڑائی ہے۔ برصغیر کے جلیل القدر ربانی علماء اور مشائخ کبار نے اسی جگہ مہینوں اور برسوں قیام اور اعتکاف کرکے درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ریاضت و مجاہدے سے پوری فضا کو معطر رکھا۔ محدث حاجی محمد الکشمیری، حضرت شیخ یعقوب صرفی، حضرت

[1] وقف نامہ و قبالہ شریف خانقاہ معلی سرینگر مطبوعہ سرینگر: ص ۳۔

شیخ عبدالوہاب سرہندی، حضرت شیخ عبدالاحد وحدت مجددی سرہندی، شیخ حبیب اللہ نوشہروی، شیخ علاء الدین المعروف بہ شیخ بابا دالی کبروی (مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ نقشبندی) سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کشمیری، حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب نقشبندی، حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی بخاری، حضرت خواجہ معین الدین نقشبندی اور امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیری محدث رحمہم اللہ کی وعظ و تبلیغ اور ارشاد و تربیت کی مجلسوں، ذکر و مراقبہ اور تعلیم و تدریس کے مشاغل سے اس خانقاہ نے تاریخ کے مختلف ادوار میں اسلامی فکر و ثقافت کی تجدید و احیاء میں نمایاں ترین کردار ادا کیا ہے۔

میر سید محمد ہمدانی کے کمال فراست کا ایک روشن ثبوت یہ بھی ہے کہ انھوں نے مذکور الصدر تاریخی دستاویز میں اس خانقاہ کے متولی، ناظر، زائرین، ذاکرین، درویشوں اور مبلغوں کے فرائض اور ذمے داری کی جانب بھی واضح اشارے کیے ہیں جس سے نہ صرف خود ان کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ عہد وسطیٰ میں صحیح اسلامی تصوف کے خد و خال بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس میں متولی اور ناظر خانقاہ کو جو ہدایات دی گئی ہیں ان میں کچھ اس طرح ہیں:

۱- از احوال و اعمال ساکنان و مسافران باخبر باشد۔

خانقاہ کے ہمسایوں اور خانقاہ میں ٹھہرنے والے مسافروں کے حالات اور حرکات سے باخبر رہے۔

۲- بزرگاں را خادم، کہتراں را برادر و یتیماں را پدر باشد۔

بزرگوں کا خادم، سماج کے نچلے طبقے کے لوگوں کے لیے بھائی اور یتیموں کے

ساتھ باپ کا سلوک کرے۔

۳- اگر از درویشے نعوذ باللہ زلتے واقع شود آنرا ایک بار و دو بار عفو کند اگر سوم کرت از و آنچناں بینند او را منع و زجر کند بلکہ او را از خانقاہ اخراج کند[1]

اگر کسی درویش سے - خدا بچائے - لغزش اور غلطی صادر ہو جائے تو ایک یا دو بار اسے معاف کیا جائے اگر تیسری بار اسے پھر اسی غلطی کا ارتکاب کرتے ہوئے پایا جائے گا تو اسے زجر و توبیخ کی جائے گی بلکہ خانقاہ ہی سے خارج کیا جائے گا۔

۴- دو وقتہ روزی برائے فقرا جوار ساکنان خانقاہ میسر دارد۔

خانقاہ سے ملحق آبادی میں جو لوگ نادار اور مسکین رہتے ہیں انہیں بھی خانقاہ کی جانب سے ہی دو وقت کا کھانا میسر رکھا جائے گا۔

۵- درمیان خواجہ و گدا، امیر و وزیر و صغیر و کبیر و خورد و بزرگ تسویہ رعایت کند۔ نہ آنکہ در پیش بزرگاں اکثر و الطف طعام گزارد و نزد خورداں اقل و اخس۔

کھانا جو خانقاہ کی طرف سے غریبوں اور درویشوں کو دیا جائے گا اس میں مساوات کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ خواجہ و گدا، امیر یا وزیر، چھوٹا یا بڑا ہر ایک کو یکساں کھانا دیا جائے گا، یہ نہیں کہ بڑوں کو اچھا اور زیادہ اور چھوٹوں کو معمولی اور کم۔

---

[1] وقف نامہ: مطبوعہ انتظامیہ کمیٹی خانقاہ معلی، سرینگر۔

۶- برہنگاں را بپوشانند و گرسنگاں را سیر گردانند تا عنداللہ ماخوذ نباشند۔

جو لوگ لباس کے محتاج ہونگے انہیں لباس پہنایا جائے گا، جو بھوکے ہونگے انہیں آسودہ کیا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ماخوذ نہ ہوں گے۔

یہ چند اشارے عہد وسطیٰ کے صوفیائے کرام کی اسلام پسندی، انسان دوستی، غربا پروری، احترام آدمیت اور فکر آخرت سمجھنے کے لیے دوسرے دفاتر کھنگالنے سے بے نیاز کر دیتے ہیں۔

خانقاہ معلی کے علاوہ خانقاہ سوپور، خانقاہ دچی، خانقاہ پانپور اور خانقاہ درگجن کی بنیاد بھی سید محمد ہمدانی کے ہاتھوں ہی پڑی ہے۔ یہ خانقاہیں آج بھی اپنے مخلص بانی کے فکری اور روحانی ورثے کی بڑی حد تک حفاظت کرتی ہیں۔

سلطان سکندر اور وزیر اعظم کا تاثر میر سید محمد ہمدانی کشمیر میں اپنے قیام کے دوران ایک بے تاج بادشاہ کی طرح رہے۔ عوام اور خواص میں انہیں بے مثال محبوبیت و مخدومیت حاصل رہی۔ وزیر اعظم نے جو ایک ہندو برہمن طبقے سے تعلق رکھتا تھا، نہ صرف سید محمد ہمدانی کو دیکھتے ہی اسلام قبول کیا بلکہ اپنی بیٹی کا نکاح بھی ان سے کر دیا، اس دور کے برہمن مورخ جونراج کے مطابق یہ نو مسلم وزیر اعظم جس کا سابق نام سہ بٹ اور اسلامی نام ملک سیف الدین تھا اسلام پھیلانے میں سلطان سکندر سے کہیں زیادہ پر جوش ثابت ہوا۔ وہ لکھتا ہے:

"سہ بٹ نے ویدوں کی تعلیمات کی کوئی تعلیم و توقیر نہیں کی۔ اس نے ملیچھوں کے اشاروں پر چل کر سکندر کو اوتاروں کی مورتیاں بگاڑنے پر آمادہ کیا[1]...

[1] KINGS OF KASHMIR, VIII, P.65

.... سلطنت پر سہ بٹ کی گرفت اس قدر مضبوط ہوئی کہ اس کے سامنے کوئی بھی صاحب اقتدار سر نہیں اٹھا سکتا تھا چاہے وہ خود سلطان یا راج کنور ہی کیوں نہ ہو[2]۔

جہاں تک سلطان سکندر کا تعلق ہے تو میر سید محمد ہمدانی کے تئیں اسکی عقیدت عشق کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اس کے عہد میں کشمیر اگرچہ اسلامی علوم کی سرگرمی اور اسلامی فکر و ثقافت کی ترویج و اشاعت میں بقول فرشتہ عراق اور ایران کا مثنیٰ بن گیا تھا تو اس میں میر سید محمد ہمدانی کے اخلاص و ایثار اور تمناؤں کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے اقتدار سے دامن بچا کر تمام ارباب اقتدار کو اپنا گرویدہ بنا دیا تھا، انہوں نے خود سکندر شاہ کی سیرت سازی کے لیے کئی بزرگ اس کے ساتھ وابستہ رکھے ان میں ایک بزرگ سید حسین خوارزمی تھے جو سلطان کو قرآنی تعلیمات سکھاتے تھے۔

میر سید محمد ہمدانی کے بارے میں بعض مورخین نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ انہی کے اشارے پر نو مسلم وزیر اعظم نے غیر مسلموں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک کیا تھا، حالانکہ یہ ہرگز صحیح نہیں ہے بلکہ حق بات یہ ہے کہ زیادتی کرنے کی طرف حکومت وقت کو کوئی نوبت ہی نہیں آئی تھی دراصل میں کشمیر اس زمانے میں ایک انقلابی دور سے گزر رہا تھا۔ کشمیر کے نچلی ذات کے طبقے برہمنوں، جاگیرداروں ارباب حکومت اور افسر شاہی نظام کے ہاتھوں طویل مدت سے ذلت اور زبوں حالی میں مبتلا چلے آرہے تھے، اسلامی انقلاب کے بدولت انہیں عزت، آزادی،

[2] KINGS OF KASHMIR, VIII, P.65

خود اعتمادی اور خوش حالی کی زندگی گزارنے کے لیے حوصلہ افزا اور ولولہ انگیز مو
فراہم ہوئے۔ حکومت وقت نے انہیں استحصالی عناصر اور طبقہ واریت کے عذ
سے نجات دلائی۔ استحصالی عناصر نے یہ اصلاحات قبول کرنے سے صریحاً انکار کیا
جونراج نے خود ہی لکھا ہے :

"جب وزیر اعظم نے قانوناً طبقاتی تفاوت مٹانے کا ارادہ کیا تو برہمنوں نے
واضح کیا کہ وہ جان کی بازی لگا کر ذات پات کی حفاظت کریں گے"[ل]

اس وقت کی تاریخیں کسی برہمن کے جان پر کھیل کر حکومت سے ٹکرانے
کے ذکر سے یکسر خالی اور عاری ہیں۔ خود جونراج نے سراپا احتجاج ہونے کے باوجو
اس قسم کا کوئی واقعہ ذکر نہیں کیا ہے اور نہ کسی غیر مسلم کو جبراً مسلمان بنانے کی طرف
اشارہ کیا ہے۔ جن غیر ذمہ دار مسلمان مورخوں نے اس قسم کے افسانے تراش تراش
کر اپنی کتابوں کو بوجھل بنا دیا ہے تو وہ صرف عقیدتمندانہ غلو اور اکابر پرستی کا ایک
رومانوی اسلوب ہے، جس کا ربط و اعتدال سے محروم ہونا ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔

ریشیت کی اصلاح اور اسلامی ریشیت کا قیام

حضرت میر سید محمد ہمدانی کا ایک اور نمایاں ترین تبلیغی و
اصلاحی کارنامہ کشمیر کی صدیوں پرانی ریشیت کی اصلاح
اور یہاں کے ریشی صاحبان کی اصلاح و تربیت ہے۔ یہاں کے معاشرہ کی
تعمیر و تشکیل میں ہزارہا سال سے اس جماعت کا بڑا حصہ رہا ہے۔ یہاں کی ریشیت
اپنی خاص انفرادیت رکھتی تھی۔ اس میں کسی خاص مذہب کی کوئی خاص قید و بندش
نہیں تھی۔ گویا ریشیت اصل اور مذہب فرع اسلام شایع ہونے سے پہلے یہ

ل - KINGS OF KASHMIR, TR. J.C. DUTT, VIII

ریشیت مذہبی اعتبار سے بدھمت اور ہند و فکر و فلسفہ کا آمیزہ تھی۔ اسلامی انقلاب
سے پہلے یہاں کے صوفیائے کرام بھی اس ریشیت سے بے حد متاثر تھے۔ جب
امیر کبیر سید علی ہمدانی، ان کے فرزند میر سید محمد ہمدانی اور ان کے سینکڑوں رفقاء
نے ایک ساتھ اصلاحات کا بیڑا اٹھایا تو انہوں نے مقامی ریشی صاحبان کو بھی
بڑی کامیابی سے اپنی طرف راغب کیا۔ اس ربط و تعلق کے نتیجے میں ان کے عقائد
و افکار سے یہاں کی ریشیت بھی متاثر ہوئی۔ بالخصوص میر سید محمد ہمدانی اور
سرخیل ریشیاں شیخ نور الدین ولی کی باہمی ملاقات اور اخذ و افادے کے نتیجے میں
یہاں کی ریشیت باقاعدہ دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ اب شیخ نور الدین ریشی کی
ریشیت کے لیے قبول اسلام بنیادی شرط بن گئی۔ حضرت شیخ نے خود ہی اپنی سابق
طرز زندگی اور طریق فکر کی تغلیط کی۔ اگرچہ مغلیہ دور حکومت تک ریشیت پھر بھی
اپنی کچھ نہ کچھ انفرادیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہی تاہم وقت کے گزرنے کے
ساتھ ساتھ یہ انفرادیت بھی بالآخر ختم ہوگئی اور محققین صوفیائے کرام کی کوششوں سے
احسان و سلوک میں تحلیل ہوگئی۔

مقامی ریشی صاحبان سے مخلصانہ روابط اختیار کر کے حضرت میر سید محمد
ہمدانی اور ان کے رفقاء نے کشمیر میں ایک اور عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔ وہ
یہ کہ انہوں نے ریشی صاحبان کو غار نشینی، جنگل پیمائی، فاقہ کشی اور زندگی سے فرار
اختیار کرنے سے نجات ہی نہیں دلائی بلکہ انہیں تبلیغ دین کے میدان میں اتار کر
بلند و بالا پہاڑوں، لق و دق بیابانوں اور وحشت ناک جنگلوں میں اسلام کا نور
پھیلانے کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ کچھ ہی مدت میں تبت تک انہی ریشی صاحبان

کی تبلیغی سرگرمیوں سے رہبانی قندیلوں کا ایک طویل سلسلہ وجود میں آیا جس نے بہت سے بھٹکے ہوئے مسافروں کی راہنمائی کی۔

حضرت میر سید محمد ہمدانی بڑے ذہین عالم دین اور اپنے مشن کے حد درجہ مخلص مبلغ تھے۔ انہوں نے یہاں پہنچ کر نو مسلم کشمیری مسلمانوں کے لیے ان کی مادری زبان کی اہمیت اور افادیت محسوس کی ہوگی۔ اس طرح جو شخص اس زمانے میں کشمیری زبان کا بلبل ہزار داستاں تھا اس کو اسلامی تعلیمات کے گیت گانے کی طرف راغب کیا ہوگا۔ حضرت شیخ نورالدین ولی نے اس فریضے کو اس خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ انجام دیا کہ ان کا منظوم کلام آج بھی کشمیری زبان میں لکھی ہوئی پہلی دینیات کا درجہ رکھتا ہے اور اپنی ادبی لطافت کے اعتبار سے آخری بھی۔

میر سید محمد ہمدانی بحیثیت ایک مصنف اور شارح

سید محمد ہمدانی بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح صاحب قلم تھے۔ ان کے والد کے پاس کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا، جس کا ایک بڑا حصہ وہ کشمیر لائے تھے مگر وہ راستے میں چوروں کی نذر ہوا تھا، خود انہوں نے کم و بیش چھوٹی بڑی ڈیڑھ سو کتابیں بطور یادگار چھوڑی تھیں۔ سید محمد ہمدانی کشمیر وارد ہوئے تو وہ دینی اور فکری علوم سے لیس تھے، یہاں تک کہ تحریری صلاحیت بھی پیدا کر چکے تھے۔ داود مشکوتی محدث نے ان کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع کیا ہے:

" سپہ سالار طریقت بود و طیر طیار حقیقت و عالم بعلم ظاہر و باطن، در علم باطن کلمات عالی دارد و دراں مصنفات جمع کردہ است "[1]

[1] اسرار الابرار (قلمی)

اس زمانے میں جو ارباب علم و فن یہاں وارد ہوئے وہ سلطان سکندر اور اس کے ارکان حکومت کی نظروں میں زیادہ سے زیادہ عزت و وقار حاصل کرنے کے لیے اپنی نگارشات پیش کرتے تھے۔ ہر چند میر سید محمد ہمدانی کا قرب و احترام ایسی کسی شرط سے مشروط نہیں تھا تاہم انہوں نے یہاں وارد ہوتے ہی علم منطق کے مشہور رسالہ "شمسیہ" کی شرح لکھی۔ ڈاکٹر زبید احمد نے برصغیر میں عقلی علوم پر لکھی ہوئی کتابوں میں اس شرح کو سب سے پہلے ذکر کیا ہے[1] اس کے بعد بھی سید محمد ہمدانی نے تبلیغ دین، سلوک، تربیت اور اصلاح معاشرہ کی زبردست مصروفیات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا، یہاں تک کہ شیخ عبدالوہاب نوری نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے تصوف کے موضوع پر ان کے پینتالیس رسائل کا مطالعہ کیا ہے[2] ان رسائل میں "الرسالۃ الاسکندریہ" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی، عہد وسطیٰ کے سرکردہ کشمیری علما بھی اس کی تعریف کرتے تھے۔ گو یہ رسالہ آج موجود نہیں ہے، تاہم مشکوتی اور مورخ کشمیر ملک حیدر چاڈورہ کے زیر مطالعہ رہا ہے:

" رسالۂ اسکندریہ برائے سلطان تالیف فرمود و در آں تصریح نمودہ
در آں وقت در سن بیست و دو سال بود "[3]

سلطان سکندر شاہ کے لیے ایک رسالہ لکھا جس کا نام سلطان ہی کے نام پر رسالہ اسکندریہ رکھا۔ اس میں وضاحت سے لکھا ہے کہ اسے بائیس سال کی

[1] THE CONTRIBUTION OF INDIA TO ARABIC LITERATURE, P345

[2] فتوحات کبرویہ (قلمی) [3] اسرار الابرار۔

عمر میں تالیف کیا ہے، مورخ حیدر ملک نے اسی رسالہ کے بارے میں لکھا ہے:

"الحق کمال تحقیق و تدقیق بجا آورده و دانایان عصر پشت دست گزاشتند"[1]

ان کا ایک اور رسالہ جامع الفنون ندوۃ العلماء کے سابق ناظم اور نامور ادیب اور مورخ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کو دستیاب ہوا تھا "و انی ظفرت برسالۃ لہ تسمی جامع الفنون"[2] ممکن ہے یہ رسالہ آج بھی ان کے ذاتی کتب خانہ یا ندوۃ العلماء کی لائبریری میں موجود ہو۔ اس کا تعلق بھی منطق اور حکمت سے ہے، اس کی چند ابتدائی سطور بھی مولانا ممدوح نے نقل کی ہیں جو تاریخی اعتبار سے قیمتی ہیں۔ پہلی اہم بات یہ ہے کہ مولف نے اشارہ کیا ہے کہ جس وقت وہ اس رسالے کی تصنیف سے فارغ ہوئے تھے اس وقت ان کی عمر تیئیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دوم یہ ہے کہ اس میں ان کی یہ کوشش کارفرما رہی ہے کہ تصوف اور فلسفے کے درمیان موافقت کی راہ تلاش کی جائے۔

اردت مع صغر السن و قصور البضاعۃ والفتور فی ھذہ الصناعۃ (ای العلوم الحکمیۃ) ان اجمع العلوم الکشفیۃ والعقلیۃ المشهورۃ المعتبرۃ فی نسخۃ واحدۃ[3]

کم عمری اور علوم عقلیہ میں مہارت نہ رکھنے کے باوجود میں نے یہ کوشش کی ہے کہ ایک ہی جلد میں کشفی علوم اور مستند و معتبر فکری مباحث کو اکٹھا کروں۔

مولف چاہے اپنے مدعا میں کامیاب ہوئے ہوں یا نہیں مگر آج سے چھ سو

[1] تاریخ کشمیر (قلمی)، ورق ۲۲ [2] نزہۃ الخواطر ج ۳ ص ۱۴۲-۱۴۳ [3] ایضاً۔

سال پہلے کے "صوفی۔ مبلغ" کا اس طرح کی علمی خدمات انجام دینے کا ارادہ کرنا ہی اس کی ربانی بصیرت اور خداداد فراست کی غمازی کرتا ہے۔ دور جدید میں بعض علمی حلقوں میں مذہب اور سائنس یا طبعیات 'PHYSICS'، کو مابعد الطبعیات "META-PHYSICS" کے ربط و توفیق میں جو دلچسپی لی جارہی ہے عہد وسطیٰ کے ایک درویش طبیعت نوجوان عالم نے بہت پہلے اس موضوع کی اہمیت محسوس کی تھی۔

عہد مغلیہ کے ایک سرکردہ عالم دین علامہ داؤد خاکیؒ نے دستور السالکین میں سید محمد ہمدانی کے کسی اور رسالے سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے: "و بیان این اطوار در رسالہ سید محمد بن میر سید علی الهمدانی قدس سرہما آوردہ است"[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مغلیہ دور کے بلند مرتبہ علماء اور اصحاب معرفت حضرت سید محمد ہمدانی کی تالیفات سے نہ صرف استفادہ کرتے تھے بلکہ انہیں قابل استناد بھی سمجھتے تھے۔

میر سید محمد ہمدانی کے ہم سفر مبلغین اسلام

سلطان سکندر شاہ کشمیری کی عالی ظرفی اور دینداری سے کشمیر وسط ایشیا کے چند ممتاز ترین علماء، اصحاب معرفت، شعر و ادب کے ماہرین اور ارباب صنعت و حرفت سے آباد ہوا اور بقول فرشتہ کشمیر علمی و فکری ترقی میں ایران اور عراق کا ہمسر بن گیا۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان سب نووارد مسلمانوں کی راہنمائی میر سید محمد ہمدانی کرتے تھے یا ان لوگوں کا عبور و مرور ان ہی کی پشت پناہی پر ہو رہا تھا۔ میر سید محمد ہمدانی کے رفقاء کے بارے میں ہمارے مستند مورخوں نے واضح کیا ہے کہ وہ صرف تین سو

[1] دستور السالکین، الیکٹرک پریس لاہور: ص ۲۱۔

بزرگوں کو اپنے ہمراہ لائے تھے۔ انہوں نے اپنے ان رفقاء کو صرف تبلیغ دین، قرآن وحدیث کے درس وتدریس اور تزکیۂ اخلاق کی خدمت تفویض کی تھی نیز انکے تعاون سے اس خانقاہی نظام کو خلوص وانہماک سے تقویت پہنچانا مقصود تھا جس کی داغ بیل ان کے والد بزرگوار بلکہ ان سے قبل حضرت شیخ شرف الدین عبد الرحمٰنؒ یہاں ڈال چکے تھے، چنانچہ ان بزرگوں نے یہ خدمت بڑی عمدگی اور کامیابی سے انجام دی۔ ان کی کوششوں سے یہاں کا چپہ چپہ توحید ورسالت کے زمزموں سے آباد ہوا۔ ہم یہاں ان کے چند سربرآوردہ رفقاء کے نام اور جائے اقامت درج کرتے ہیں جہاں آج بھی ان کے نام پر کوئی نہ کوئی مسجد، خانقاہ، درسگاہ یا مقبرہ بطور یادگار موجود ہے۔

۱۔ سید محمد مدنی (نوشہرہ، سرینگر) ۲۔ سید محمد حصاری (سکندر پورہ، سرینگر) ۳۔ سید علی اکبر (تاشوان، سرینگر) ۴۔ سید محمد کرمانی (تاشوان، سرینگر) ۵۔ سید [illegible] زندہ پوش (مزار سلاطین، سرینگر) ۶۔ سید حاجی محمد (رعناواری، سرینگر) ۷۔ سید نور الدین (رعناواری، سرینگر) ۸۔ سید محمد (رعناواری، سرینگر) ۹۔ سید محمد اصفہانی عرف جانباز ولی (بارہمولہ) ۱۰۔ سید محمد افضل (نوشہرہ، سرینگر) ۱۱۔ سید خلیل عزیزی (سدرہ بل، سرینگر) ۱۲۔ سید کمال صاحب (نا ندکھے، بڈگام) ۱۳۔ سید محمد قریش (بجبہاڑہ، اسلام آباد) ۱۴۔ سید عبد اللہ (بجبہاڑہ، اسلام آباد) ۱۵۔ سید عبد اللہ (ایضاً) ۱۶۔ سید محمد مراد (ایضاً) ۱۷۔ سید محمد عین پوش یا آہن پوش (کنہ کدل، سرینگر) ۱۸۔ سید عبد اللہ عزیزی (نوشہرہ، سرینگر) ۱۹۔ سید کمال صاحب (متصل مسجد سدکرہ ماجی) ۲۰۔ سید علاء الدین بخاری فرزند سید

جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت (سکندر پورہ، سرینگر) ۲۱۔ سید زیرک معروف بہ سید ضیاء الدین (کاندہامہ، بڈگام) ۲۲۔ سید حسین سامانی ازینہ کدل، سرینگر) ۲۳۔ سید فخر الدین (نیوہ، بڈگام) ۲۴۔ سید عبد اللہ (اندرواری، سرینگر) ۲۵۔ سید محمد لورستانی (حوالی جامع مسجد سرینگر) سید محمد خاوری (فتحکدل، سرینگر) ۲۷۔ سید احمد سامانی (فتحکدل، سرینگر) ۲۸۔ سید علی اکبر (مائسمہ لال چوک، سرینگر) ۲۹۔ سید قطب الدین (قطب الدین پورہ سرینگر) رحمہم اللہ۔

میر سید علی ہمدانی اور میر سید محمد ہمدانی کے ان رفقاء کو کشمیر کے قدیم ہندو مورخین "یون" اور "ملیچھ" کہہ کر یاد کرتے ہیں جبکہ اسلامی دور کے مورخین انہیں "سید" جیسے تعظیمی لقب سے ذکر کرتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ یہ سب بزرگ نسباً سید ہوں۔ ان کی عظمت وبزرگی اپنی جگہ مسلم ہے جو کسی نسبی فخر پر قائم نہیں ہے۔ علم وعمل کے میدان میں انہوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کا کچھ تذکرہ سید علی، اعظمی، حسن، عبد الصبور ہادی اور عبد الوہاب نوری نے اپنی تالیفات میں محفوظ کیا ہے۔

کشمیر سے مراجعت اور انتقال حضرت میر سید محمد ہمدانی کے کشمیر میں مدت قیام کے بارے میں مورخین کا اختلاف کافی مشہور ہے: مورخ سید علی (معاصر مرزا حیدر دوغلات صاحب تاریخ رشیدی) کے مطابق وہ یہاں بارہ سال ٹھہرے:

"مدت دوازدہ سال جناب سید محمد ہمدانی دریں دیار گرفتہ"[1]

اس تحقیق کے مطابق سید محمد ہمدانی جو بالاتفاق ۷۹۶ھ میں یہاں وارد ہوئے

---

[1] تاریخ سید علی (قلمی)

تھے ۸۰۰ھ میں یہاں سے واپس تشریف لے گئے، آج بھی وادی میں موجود جتنی بھی
مسجدیں اور خانقاہیں یہاں موجود ہیں اور جن میں سرینگر کی خانقاہ معلی بھی
شامل ہے، اسی بارہ سالہ مدت کے دوران تعمیر ہوئی ہیں نیز وہ تاریخی وقف
نامہ جو سلطان سکندر شاہ اور ان کے درمیان طے پاکر قید تحریر میں لایا گیا ہے،
وہ بھی اسی بارہ سالہ مدت کے درمیان ہی وجود میں آیا ہے تاہم ہمارے کئی
اہل قلم اور مورخین نے ان کا قیام ۱۸ سے ۲۲ سال کے درمیان بھی ذکر کیا ہے،
اس کی تائید میں یہ حضرات اس اجازت نامے کا خصوصیت سے ذکر کرتے
ہیں جو انہوں نے حضرت شیخ نورالدین ولی کو سلسلۂ کبرویہ میں بیعت ہونے
کے بعد مرحمت فرمایا تھا اور جس پر ۸۱۴ھ واضح حروف اور مہر کے ساتھ درج ہے۔

بہر حال حضرت امیرؒ نے جتنی بھی مدت کشمیر میں گزاری وہ بڑی بابرکت ثابت ہوئی،
انہوں نے کشمیر میں اسلام کی اشاعت کو یقینی اور پائیدار بنانے کے لیے جتنے بھی محاذوں پر
جہاد کیا ان سب پر انہیں محیر العقول کامیابی حاصل ہوئی۔ اس روحانی اور مذہبی رشتے
کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہاں دو نکاح بھی کیے۔ پہلا نکاح حضرت حسن بہادر کی صاحبزادی
تاج خاتون سے ہوا جو پانچ سال کی رفاقت کے بعد انتقال کر گئیں۔ مرحومہ باغ یوسف خاں
متصل مقبرہ ملک مسعود میں مدفون ہیں۔ بڑھتی ہوئی آبادی نے آج اس پورے مقبرے کو نگل
لیا ہے تاہم نامور مبلغ دین اور قادری سلسلہ کے بلند مرتبہ پیشوا میاں سید محمد حسین صاحب علوی
قادری (م ۱۹۸۵ء)، رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی کوششوں سے بی بی صاحبہ کی ابدی خوابگاہ نمایاں
ہوئی، انہوں نے اس کی حفاظت کرنے کے ساتھ ساتھ یہاں انکی یاد میں ایک درسگاہ بھی قائم کی۔
یہ مدفن نئے قلعہ کے مغربی سمت سڑک کے کنارے پر موجود ہے۔ یہی جگہ شاہمیری دور حکومت

ہیں مقبرہ ملک مسعود ٹھاکر کے نام سے موسوم تھا اور آج محلہ ملک آنگن کے نام سے جاتا
جاتا ہے۔ سید محمد ہمدانی کا دوسرا نکاح نو مسلم وزیر اعظم ملک سیف الدین کی دختر سے ہوا
تھا جن کا نام بی بی بارعہ تھا۔ یہ خاتون بھی مختصر رفاقت کے بعد ہی چل بسیں۔ ان کا
مقبرہ ناگام میں آج بھی موجود ہے۔

مذہبی اور روحانی رشتوں کے ساتھ اس جسمانی رشتے کا تقاضا بظاہر یہی تھا
کہ حضرت میر سید محمد ہمدانی کشمیر ہی میں مستقل قیام فرمائیں۔ مگر بارہ[12] یا بائیس[22] سال کے
قیام کے بعد انہوں نے کشمیر چھوڑنے کا عزم کیا، محدث مشکوتی نے اس کی وجہ
یہ لکھی ہے کہ حضرت سید محمد ہمدانی اور ایک دوسرے مہاجر مبلغ حضرت سید محمد
حصاری کے درمیان کسی بات پر بے لطفی پیدا ہوئی جو باہمی منافرت پر منتج ہوئی:

"از سکونت ایں دیار ملول شدہ از یں اقلیم رخت اقامت بربستہ عازم مسافر
بزیارت حرمین جازم شد"[1]

اگر یہ صحیح ہے تو اس میں تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب
محدث دہلوی نے معاصرت کو منافرت کی جڑ بتایا ہے، ہماری تاریخیں اس قسم کے
حادثات سے بھری پڑی ہیں اور آج بھی ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

سید محمد ہمدانی حرمین شریفین کی زیارت کی نیت سے (بتحقیق شیخ عبدالوہاب
نوری) ۸۱۹ھ میں کشمیر سے روانہ ہوئے[2]۔ زیارت سے فارغ ہونے کے بعد
وہ آبائی وطن ختلان وارد ہوئے اور یہاں مزید پینتالیس[45] سال زندہ رہے۔ ۸۵۴ھ
میں یہیں انکا انتقال ہوا اور اپنے والد بزرگوار کے پہلو میں آسودۂ خواب ابدی ہوئے۔
انکی زندگی کے آخری ۴۵ سال کے حالات اور کارنامے مکمل طور پر پردۂ خفا میں ہیں۔

---

[1] اسرار الابرار [2] فتحات کبرویہ۔

مولانا احمد بن سلیمان الکرد الاحمد آبادی

از

ڈاکٹر زبیر قریشی۔ احمد آباد

(۲)

مندرجہ بالا حقایق کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مولانا احمد کی زندگی کا نصب
تھا کثرت مطالعہ مسلسل تفکر و تفحص علماء پر نقد و تبصرہ ان سے اختلاف یا اتفاق ب
پھر ان کی تحقیقات پر اضافہ۔ ندرت مفاہیم و ابتکار مطالب جو ان کے دل میں القا
ہوئے ہیں انہیں وہ فیوض ربانی گردانتے ہیں، حقیقی ملہم صواب کی اس نعمت کبری پر
وہ متشکر ہیں۔ نکات نادرہ کے متواتر انکشاف کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو محقق سمجھ
ہیں اور تقلید سے حتی الامکان اپنا رشتہ توڑ لیتے ہیں۔ مختلف علوم و فنون میں علما
کبار کی متداولہ کتب پر انہوں نے اس کثرت سے حواشی و تعلیقات لکھے کہ بعد کے
لوگوں نے انہیں مروج علوم عقلیہ سمجھا۔ فارسی میں ان کی کوئی تصنیف اب تک نہیں
علم کلام، عقائد، فقہ، منطق والہیات ان کے دلچسپی کے موضوع رہے ہیں، ان موضوعات
پر عام طور پر مدارس میں عربی ہی میں درس و تدریس ہوتی تھی لہذا انہوں نے
بھی عربی کو اپنے اظہار خیالات کا ذریعہ بنایا۔ حدیث میں اسماء رجال پر ۲ ضخیم
جلدیں مرتب کیں اور مکہ معظمہ سے بھی حدیث شریف ہی کی کتابیں خریدیں، ان

حدیث کی طرف بھی انہیں رغبت تھی۔ تفسیر میں ان کا ایک چھوٹا رسالہ عربی میں ملتا
ہے جس کا ذکر آگے آئے گا اور کشاف پر حاشیہ بھی انہوں نے لکھا مگر ایسی آیات پر
جن کا تعلق کلام سے تھا۔ اخیر میں انہوں نے اپنے منتشر اور متفرق حواشی جمع کرنے
کی کوشش کی مگر وہ سب ہم تک نہیں پہونچے۔ کاتبوں نے مختلف علوم و فنون کی
کتابوں میں ان سے منسوب تعلیقات کثرت سے نقل کیے ہیں۔ ان میں ولی اللہ
خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اخیر عمر کے ان کے معاصر تھے۔ متضاد فرقوں کے عقائد کا
مطالعہ اور ان کی تردید پر بھی انہوں نے قلم اٹھایا ہے۔ حالانکہ وہ ملک احمد بن نبیر محمد
فاروقی کے ہمعصر تھے۔ حج بھی انہوں نے ان کی طرح سنہ ۱۰۸۱ھ میں کیا مگر کہیں انہوں
نے روافض کے غلبہ کا ذکر نہیں کیا۔ مولانا عبدالعزیز کے متفرق اوراق پر لکھے ہوئے
حواشی و تعلیقات ضایع ہونے لگے تھے۔ یہ شکایت ملک احمد بن نبیر محمد فاروقی کی
طرح انہوں نے بھی کی ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ کسی کتاب کا مطالعہ کریں اور اس پر
اپنے حواشی اور تعلیقات نہ لکھیں۔ خود اپنی تالیف کا دوبارہ مطالعہ کرنے کا موقع
ملتا تو وہ اس پر نظر ثانی کرتے تھے اور اپنے غور و خوض کی روشنی میں مزید اضافہ کرتے
تھے جیسا کہ انہوں نے مختار الاختیار میں کیا۔ پیہم علمی تفکر ان کی فطرت ثانی بن گئی تھی۔
متقدمین کے خیالات کے ساتھ مباحثہ ان کا مسلک تھا۔ اسی سلسلہ میں ان کا ایک
چھوٹا رسالہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ یہ مختصر رسالہ خود مولانا احمد کے خط میں ہے۔
کتبخانہ حضرت پیر محمد شاہ میں تفسیر مدارک کا ایک نسخہ ہے۔ مولانا احمد کے پوتے
محمد رضا نے اپنے خط میں تفسیر مدارک کے حاشیہ میں سورۂ انعام کی تفسیر میں پورا
رسالہ منتقل کر دیا ہے۔ گویا مذکورہ کتبخانے میں اس کے دو نسخے ہوئے۔

سورۂ انعام میں یہ آیت کریمہ ہے یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ آیَاتِ رَبِّکَ لَا یَنْفَعُ نَفْسًا اِیْمَانُھَا لَمْ تَکُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ کَسَبَتْ فِیْ اِیْمَانِھَا خَیْرًا۔ زمخشری نے کشاف میں اس کی جو تفسیر بیان کی ہے وہ معتزلہ کے نقطۂ نظر سے ہے۔ احمد آباد کے سارے علماء اشاعرہ تھے۔ کتب خانہ پیر محمد شاہ میں مختلف مخطوطات میں ان کے اقتباسات بکھرے پڑے ہیں۔ ان سب نے زمخشری کے موقف کی تردید کی ہے مثلاً عماد الدین طارمی، شیخ نصرت محمد عباسی، شیخ محمد شریف، عبد الفتاح اور حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی۔ ان میں اکثر حضرات مولانا احمد کے استاد اور ان کے استاد کے استاد ہیں، نیز عبد الفتاح ان کے معاصر۔ گویا اس زمانہ میں گجرات کے علماء میں یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ قیامت کی علامات کے ظہور کے وقت کسی ایسے شخص کو جو پہلے سے مومن نہ تھا اور کسب خیر سے بھی بے بہرہ رہا ہو، ایمان لانے سے اس کے ایمان کا نفع اس کو پہنچ سکتا ہے۔ زمخشری کا خیال ہے کہ ایسے موقع پر ایمان بے سود ہے۔ ایسی ہی ایک بحث علماء میں فرعون کے ایمان کے بارے میں چھڑی ہوئی ہے۔ غرق ہوتے وقت اس نے کہا اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰی وَھَارُوْنَ۔ ابن العربی وغیرہ اس کے ایمان کے قائل ہیں۔ کچھ اور علماء اس کی تردید کرتے ہیں۔ شہر کے مخصوص علم دوست حلقہ میں اس بحث کی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دیتی ہوگی۔ اس مباحثہ میں مولانا احمد کا شریک ہونا عین فطری بات ہے۔ وہ آخری مباحث تھے۔ عربی رسالہ اور اس کے مطالب کا خلاصہ ملاحظہ ہو:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ یوم یاتی بعض آیات ربک لا ینفع نفسا ایمانھا

لم تکن آمنت من قبل او کسبت فی ایمانھا خیرا۔ استدل زمخشری بھذہ الآیۃ علی مذھبہ وھو مجرد الایمان بدون کسب الخیر لا ینفع فی النجاۃ من الخلود فی النار وتقریرہ ان اولا (یقاع ؟) احد الامرین وھو سیاق النفع لیفید عموم النفع کما فی قولہ تعالیٰ لا تطع منھم اثما او کفورا فیفید ان عدم النفع یکون للنفس التی لا یکون لھا ایمان ولا کسب الخیر فیہ ای من اتصف بالسلب الکلی ویتحقق النفع لمن آمن وکسب الخیر او آمن ولم یکسب الخیر الا ان الحمل علی ھذا المعنی یوجب التکرار لانہ اذا انتفی الایمان انتفی کسب الخیر فی الایمان بالضرورۃ فیکون ذکرہ لغوا یجب تنزیہ کلامہ تعالیٰ عنہ فوجب ان یحمل علی النفی العموم۔ والمعنی ان عدم النفع یکون للنفس التی انتفی منھا مجموع الایمان وکسب الخیر فیہ ای من اتصف برفع الایجاب الکلی و ھی اما نفس کافرۃ لم تکن آمنت من قبل او نفس مومنۃ لم تکسب الخیر فی ایمانھا فافاد ان مجرد الایمان بدون کسب الخیر غیر نافع وھو المطلوب والحاصل ان ھھنا ثلثۃ نفوس احدیھا التی آمنت من قبل وکسب الخیر فیہ۔ وھذہ النفس ینفعھا ایمانھا بالاتفاق وثانیھا لم تومن من قبل وآمنت فی ذالک الیوم وایمانھا غیر نافع باتفاق۔ وثالثھا التی آمنت من قبل ولم تکسب فیہ خیرا وھذا ھو المختلف فیہ۔ فعند اھل السنۃ

ایمانهما نافع وعند المعتزلة ایمانهما غیر نافع۔ واذا وجب
حمل الآیة علی رفع الایجاب الکلی لما عرفت من لزوم التکرار علی
تقدیر السلب الکلی ثبت عدم نفع الایمان للاخیرین فلا تنفع
الایمان المجرد بدون العمل۔ هذا محصل ما رامه الزمخشری
من الاستدلال علی مذهبه۔

واقول قد کثر الکلام من الافاضل الاعلام فی دفع هذا الاستدلال
ولم اظفر جوابا خالیا عن المناقشة والاشکال واحسن ما افاد
المظهرون لدقائق الآیات فی جوابه هو ان نفع الایمان علی
وجهین۔ احدهما من حیث الذات وهو کونه سببا النجاة عن
الخلود فی النار۔ وثانیهما من حیث العمل وهو کونه سبب القبول
العمل الموجب لرفع الدرجات فی الجنة فالایمان الحادث
فی ذالک الیوم لا ینفع فی النجاة والایمان السابق الغیر المقارن
للعمل لا ینفع فی قبول العمل فی ذالک الیوم ولا یلزم من عدم نفع
الایمان فی قبول العمل ان لا یکون نفسه منجیا عن الخلود فی النار
فلا یثبت مذهب المعتزلة۔ ومحصل الآیة ان لا ینفع الایمان
مطلقا لا من حیث الذات ولا من حیث العمل علی ما یستفاد من
نفی النفع المطلق نفسا لم تکن آمنت من قبل ولم تکسب فی ایمانها
خیرا وارتباط کل من الشقین بما یناسبه مفوض الی فهم
السامع وهذا واضح لاغبار علیه۔

فان قلت عدم قبول الکسب الحادث فی ذالک الیوم بواسطة
انتفاء شرط قبول الکسب وهو کونه بالغیب لا بسبب عدم
نفع الایمان فیه فانه لو فرض نفع الایمان السابق الغیر المقارن
للعمل فی قبول الکسب الحادث فی ذالک الیوم لکان مع ذالک عدم
قبوله بحاله لانتفاء شرط قبوله۔ قلت الملازمة المذکورة
فی قوله فرض نفع الایمان السابق الغیر المقارن الی آخره فی محل
المنع اذا المشهور ان کونه بالغیب شرط فی الایمان دون الاعمال
ویرجحه تعرض الغیب فی الاول دون الثانی فی قوله تعالی
یومنون بالغیب واما عدم نفع الایمان فی قبول الکسب الحادث
فیحتمل ان یکون تعبدیا حیث جعل الشارع طاعة المومن
الذی لم یکسب فی ایمانه خیرا قبل ذالک الیوم مثل طاعة
الکافر مع صحة ایمانه الذی اتی به قبل ذالک الیوم والله
سبحانه اعلم بحقیقة الحال۔ احمد بن سلیمان عفی عنهما

یعنی زمخشری کا استدلال ہے کہ کسب خیر کے بغیر مجرد ایمان کسی کے لیے نفع بخش
نہیں۔ مومن بے عمل کو نار جہنم سے نجات نہیں جو مومن بھی نہیں اور کسب خیر بھی نہیں
کرتا وہ تو نفع ایمان کے سلسلہ میں سلب کلی سے متصف ہو جاتا ہے۔ مومن باعمل کیلیے
ایمان کا نفع ثابت ہے، ایمان کے نہ ہونے سے کسب خیر کا نہ ہونا لازم ملزوم قرار
پاتا ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے، جس دن آپ کے پروردگار کی بعض نشانیاں ظاہر ہوجائینگی
اس روز کسی شخص کو اگر وہ پہلے سے مومن نہیں تھا یا اس نے مومن ہوتے ہوئے کسب خیر نہیں

کیا تو اس کا ایمان اسے نفع نہ پہونچائے گا۔ زمخشری کا خیال ہے کہ مومن بے عمل کے لیے نفع کے تصور سے تکرار غیر ضروری واجب ہو جاتی ہے اور ایسی باتوں سے کلام کا تنزہ بہتر ہے اور یہ محال ہے لہذا اس کو نفی عموم پر عمل کرنا ہی واجب ہے۔ ایمان و کسب خیر جس میں مفقود ہوں وہ رفع ایجاب کل سے متصف ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص یا تو کافر ہو سکتا ہے یا مومن جس نے مومن ہوتے ہوئے آثار قیامت کے ظہور کے پہلے کسب خیر نہ کی ہو پس تین گروہ ہوئے۔ ایک تو وہ جو پہلے ہی سے مومن تھا اور کسب خیر کرتا رہا۔ ایمان کے اس کو نفع بخش ہونے پر سب کا اتفاق ہے۔ دوسرا گروہ وہ جو علامات قیامت کے ظہور تک مومن نہ تھا اور اب ایمان لے آئے تو اس کو بھی ایمان نفع نہیں پہونچائے گا۔ اس پر بھی سب کا اتفاق ہے۔ تیسرا وہ گروہ ہے جو ان علامات کے ظہور سے پہلے مومن تھا مگر کسب خیر نہیں کرتا تھا۔ اس گروہ کے بارے میں اختلاف ہے۔ اہل سنت اسکے ایمان کے نافع ہونے کے قائل ہیں اور معتزلہ کے نزدیک اس کا ایمان غیر نافع ہے۔

مولانا احمد فرماتے ہیں کہ اکثر فضلاء نے زمخشری کے اس استدلال کو رد کرنے کی کوشش کی ہے مگر ان کا جواب تسلی بخش نہیں۔ اشکال باقی رہ جاتا ہے۔ اس کا بہترین جواب یہ دیا گیا ہے کہ ایمان کے دو پہلو ہیں۔ ایک ایمان بذات خود جو انسان کے نار جہنم سے نجات کا سبب بن سکتا ہے۔ دوسرا پہلو عمل کا ہے۔ یہ پہلو انسان کے عمل کی قبولیت اور جنت میں اس کے درجات کی بلندی کا موجب ہے۔ لہذا علامات قیامت کے ظہور کے وقت کسی کو اس کا نیا یا تازہ ایمان جہنم سے نجات نہ دلا سکے گا اور انکے ظہور کے بعد سرتاپا بے عمل مومن بھی اگر اب کسب خیر کرنا شروع کرے تو ان نئے اعمال صالحہ کا نفع نہ پہونچے گا اور نہ اس کے سبب اس کے درجات جنت میں بلند

ہوں گے۔ لیکن پرانے مومن کے لیے کسب خیر کے مسترد ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے مومن نے چونکہ مذکورہ آثار کے ظہور سے پہلے کسب خیر سے روگردانی کی تو اسکو اس کے پرانے ایمان کا نفع نہ پہونچے گا یا اسے جہنم سے نجات نہ دلائے گا، لہذا معتزلہ کا مذہب غلط ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ایمان کے نفع کی نفی مطلق کیا بحیثیت ذات کیا بحیثیت عمل صرف اسی کے حق میں ہے جو نہ تو اس روز سے پہلے مومن تھا نہ اپنے ایمان میں کسب خیر کیا۔ اگر آپ یہ کہیں کہ اس روز کیا گیا کسب خیر ایمان کے نفع بخش نہ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ کسب خیر کی قبولیت کی شرط کے فقدان کی وجہ سے ہے، یعنی شرط غیب تھی۔ اب آثار قیامت ظاہر ہو گئے۔ اگر عمل بغیر کے سابق ایمان کا نفع بخش ہونا فرض کیا جائے تب بھی بات نہیں بنتی کیوں کہ اس کی بھی قبولیت کی شرط غیب ہے جواب موجود نہیں بلکہ ظہور پذیر ہو چکا ہے تو میں کہوں گا کہ ایمان بالغیب کافی ہے۔ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کہا گیا ہے۔ عمل کی بات نہیں کہی گئی، نئے اعمال کی قبولیت میں ایمان کے ناکام رہنے میں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ تعبدی ہو جاتا ہے۔ شارح یا مفسر نے ایک کافر کی طاعت اور ایک ایسے مومن کی طاعت کو جس نے اس روز سے قبل کسب خیر نہیں کیا مترادف گردانا ہے اور اس کے اس ایمان کی صحت کو نظر انداز کر دیا ہے جس کا وہ اس دن کے ظہور سے پہلے پہلے ہی سے حامل تھا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

پیرایہ اظہار کے ان منطقی پیچیدگیوں سے گریز کر کے اس بات کی وضاحت کرنا چاہیں تو گجرات کے دوسرے مذکورہ علماء کے استدلال سے جو مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ایمان خواہ کسی بھی درجہ میں ہو، خواہ مقارن عمل نہ بھی ہو تب بھی اسکے

حامل کو اس کا نفع پہونچے گا وہ ہمیشہ جہنم میں نہ رہے گا۔ ایمان اگر بمقدار ذرہ کے ہو تب بھی کسی نہ کسی دن سزا بھگتنے کے بعد اس کی وجہ سے مومن کی نجات ہوگی، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ۔ یا یہ کہ اے لوگو! لا الٰہ الا اللہ کہو فلاح پاؤ گے ایمان کا نفع الگ خیر ہے اور اعمال کا نفع علحدہ ہے۔ زمخشری کے استدلال سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ احادیث اور ایسی ہی کئی احادیث کے مفہوم کی نفی ہوتی ہے اور ایمان مجرد مطلق غیر نافع ہو کے رہ جاتا ہے۔

مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب نے مولانا احمد کا ذکر اپنی یاد ایام میں بھی کیا ہے اور اپنی عربی تصنیف نزہتہ الخواطر میں بھی۔ مگر دونوں جگہ موصوف سے مولانا احمد کا سن وفات درج کرنے میں تسامح ہوا ہے۔ یاد ایام میں لکھا ہے کہ مولانا احمد کی وفات سنہ ۱۰۸۰ھ میں ہوئی جو صریحاً غلط ہے کیونکہ سنہ ۱۰۹۱ھ میں توانہوں نے فیوض القدس تالیف کی، یاد ایام کے نئے ایڈیشن میں بھی یہی تاریخ درج ہے۔ نزہتہ الخواطر میں لکھا ہے کہ مولانا احمد کی وفات سنہ ۱۰۹۲ھ میں ہوئی۔ لیکن یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ مولانا احمد کے شاگرد جلیل مولانا نورالدین گجراتی نے اپنے استاد کی تاریخ یوں کہی ہے "شمعی کہ بود از انجمن علم گل شدہ" لہٰذا مولانا احمد کی وفات کا سن وہی تسلیم کیا جائے گا جو مندرجہ بالا مصرع سے حاصل ہوتا ہے یعنی سنہ ۱۱۰۸ھ۔ واللہ اعلم بالصواب۔

احمد لطفی سیّد اور انکی علمی خدمات

از

ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی، علی گڑھ

انیسویں صدی اور بیسویں میں مصر کے اندر جن لوگوں نے معاشرتی اصلاح کا کام انجام دیا اور مصر کو آزادی دلانے کے لیے سعی وجہد کی ان میں ایک اہم نام احمد لطفی سیّد کا ہے۔

وہ ۱۵؍ جنوری سنہ ۱۸۷۲ء کو ضلع دقہلیہ کے ایک گاؤں "برقین" میں پیدا ہوئے[1]۔ ان کا خاندان حسن اخلاق، خودداری اور معاملات میں کھرے پن کی وجہ سے مشہور تھا۔ احمد لطفی سید چار سال کی عمر میں گاؤں کے مکتب میں داخل ہوئے، جہاں سات سال کی عمر میں انھوں نے پڑھنا لکھنا سیکھا اور قرآن مجید حفظ کیا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں وہ منصورہ کے ایک فوجی طرز کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے۔ اس سے فراغت کے بعد وہ سنہ ۱۸۸۵ء میں مدرسہ خدیویہ میں داخلہ کے لیے مصر گئے۔

---

[1] ڈاکٹر عبداللطیف حمزہ۔ ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر۔ طبع ثانی۔ دار الفکر العربی۔ سنہ ۱۹۶۱ء۔ ۶/۳۲، نیز دیکھئے؛ ڈاکٹر حسین فوزی۔ احمد لطفی السید۔ التجارۃ الموسسۃ المصریہ العامۃ (بدون تاریخ)، ص ۵۸۔

۱۸۸۹ء میں وہ مدرستہ الحقوق میں داخل ہوئے جس کے بعض اساتذہ یوروپین
تھے، یہاں پانچ برس تک زیر تعلیم رہے۔ تیسرے سال کے امتحان میں انہوں نے
"حق الحکومۃ فی معاقبۃ الجانی" کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا جو پسند
کیا گیا اور شیخ محمد عبدہ جیسے صاحب کمال نے بھی اس کی داد دی، کچھ دنوں کے لیے
رسالہ المؤید سے بھی وابستہ رہے۔[1]

۱۸۹۳ء میں ان کی ملاقات شیخ جمال الدین افغانی سے آستانہ میں ہوئی جن سے
انہوں نے استفادہ کیا اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہوئے، ۱۸۹۴ء
میں قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ قاہرہ کی عدالت سے وابستہ ہوئے۔[2]

۱۸۹۲ء میں خدیو عباس نے اپنے والد کے انتقال کے بعد زمام اقتدار
سنبھالا تو اس نے انگریزوں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے احمد لطفی
السید اور مصطفی کامل سے تعاون چاہا۔ اسی موقع پر "الحزب الوطنی" کا قیام عمل
میں آیا۔ جس کے ممبران میں یہ بھی شامل تھے۔[3]

ملک کی خدمت اور خدیو عباس کی امداد کے خیال سے احمد لطفی السید
سوئزرلینڈ گئے۔ یہاں ان کی ملاقات بعض مستشرقین سے ہوئی، اثریات کے
مشہور عالم نیول نے انہیں بتایا کہ یورپ انگلینڈ کی مرضی کے خلاف آپ لوگوں
کی مدد نہیں کرے گا۔ در اصل اہل مصر ہی مصر کو آزاد کرا سکتے ہیں۔[4] اسی سفر میں

[1] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۴۶/۶ و ۴۷ نیز احمد لطفی السید۔ ص ۹۳ [2] ایضاً ۴۸/۶ و
۴۹ [3] احمد لطفی السید۔ ص ۹۹ و ۹۸ [4] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۵۰/۶ و احمد لطفی
السید، ص ۱۰۶-۱۰۷۔

معارف مئی ۱۹۹۶ء

جنیوا میں احمد لطفی کی ملاقات محمد عبدہ سے ہوئی، خدیو کھلم کھلا انگریزوں کی مخالفت
مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے اسے ان کا یہ طریقہ پسند نہیں آیا۔[1]

۱۹۵۰ء میں احمد لطفی سید پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے لیکن وزیر قانون سے
اختلاف کی وجہ سے رکنیت سے مستعفی ہوگئے اور ۹ مارچ ۱۹۰۷ء کو اخبار "الجریدہ"
نکالا۔ اس اخبار کے ذریعہ ملک و قوم کی بیش بہا خدمت انجام دی، ۲۱ ستمبر ۱۹۰۷ء
کو "حزب الامۃ" کی تشکیل عمل میں آئی، جس کے وہ سکریٹری ہوئے۔[2] اس کا مقصد
مصر کو آزادی دلانا اور وہاں پارلیمانی نظام قائم کرنا تھا، اگرچہ ان کی یہ صدا عام
لوگوں اور حکمرانوں کے لیے بالکل غیر موثر تھی تاہم تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کے نظریہ
کو پسند کیا۔[3]

کہا گیا کہ وہ مصر اور دولت عثمانیہ کے مابین معاہدہ کی خلاف ورزی کررہے
ہیں اس بنا پر ان کی گرفتاری کا اندیشہ ہے مگر انہوں نے اپنے ایک مضمون میں
"استقلال کامل" اور "استقلال تام" کے فرق کو واضح کرتے ہوئے بتایا کہ اگر میں
استقلال تام کا مطالبہ کرتا تو معاہدے کی خلاف ورزی کرتا مگر میرا زور استقلال
کامل پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ مصر کو اندرونی طور سے پوری آزادی ملنی
چاہیے۔ ان کا یہ بھی نظریہ تھا کہ چونکہ ملک میں مختلف مذاہب و افکار پائے
جاتے ہیں اس لیے یہاں کسی مذہبی حکومت کی گنجائش نہیں۔ ان کے نزدیک مصر
کی ترقی کے لیے یورپ کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ کیونکہ علوم و فنون، صنعت

[1] فکر و نظر ۱۹۷۰ء۔ ۱۰/۳ و ۴، ص ۱۱۳ [2] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر۔ ۵۱/۶ [3] محمد حسین
ہیکل۔ مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ۔ مکتبۃ النہضۃ المصریۃ ۱۹۵۱ء۔ ۳۲/۱ و ۳۱۔

و حرفت اور سائنس و ٹکنالوجی میں اس کی برتری مسلم ہے۔[1] وہ مصری قومیت کے بھی علمبردار تھے۔ مصری کانفرنس میں انہوں نے ۲۹ اپریل ۱۹۱۱ء کو جو تقریر کی تھی اس میں ان کے انہی نظریات و خیالات کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔[2] مصری قومیت کے علمبردار ہونے کی وجہ سے خلافت عثمانیہ احمد لطفی کا خاص ہدف تنقید رہتی تھی اور وہ اسلامی اتحاد کو ایک خواب و خیال تصور کرتے تھے، وہ مسیحی اتحاد کو بھی لغو سمجھتے تھے، ان کا زیادہ زور قومی یک جہتی اور وطنیت پر تھا۔

سنہ ۱۹۱۵ء میں بنی سویف کی عدالت کا انہیں صدر منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد انہیں "دار الکتب المصریہ" کا سکریٹری بنایا گیا لیکن سنہ ۱۹۱۸ء میں "الوفد المصری" میں شرکت کرنے کی غرض سے اس سے استعفا دیدیا۔ ان دنوں وفد پارٹی بھی ملک کی قیادت کی خدمت انجام دے رہی تھی۔

جس وقت سعد زغلول اور عدلی یکن (۱۸۶۴-۱۹۳۳ء) کے حکومتی عہدوں سے متعلق عیسائیوں اور مسلمانوں میں مساوات و غیر مساوات کے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے اس وقت احمد لطفی نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے پھر دار الکتب المصریہ کی جانب رخ کیا اور اب اس کی اور قدیم مصری یونیورسٹی ہی تک ان کی دلچسپی محدود ہو گئی۔ جس کے سکریٹری کے فرائض وہ انجام دے رہے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں آرٹس فیکلٹی کے قیام کا پروگرام بنایا اور ملک فواد سے اس کے منظور کیے

---

[1] مذکرات فی السیاسۃ المصریہ- ۱/۳۲- نیز دیکھئے: رجاء النقاش- ادباء معاصرون- مکتبہ الانجلو المصریہ- قاہرہ- سنہ ۱۹۶۸ء- ص ۸۰ و ۹ و محمد حسین ہیکل الاتجاہات الوطنیہ- دار الارشاد- بیروت- سنہ ۱۹۷۰ء- ۱/۹۵ [2] احمد لطفی السید: ص ۱۴۹ و الہلال، اپریل سنہ ۱۹۶۳ء ص ۲۱۔

جانے کی درخواست کی۔ چنانچہ ۱۹۲۳ء میں اسے سرکاری یونیورسٹی کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔[1]

وہ سنہ ۱۹۰۷ء میں وزیر تعلیم ہوئے اور سنہ ۱۹۲۹ء میں وزارت ختم ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۰ء سے سنہ ۱۹۴۱ء تک مصری یونیورسٹی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں "مجمع اللغۃ العربیہ" کا قیام عمل میں آیا، اس وقت سے مدۃ العمر وہی اس کے سکریٹری رہے، اپنی گوناگوں خوبیوں اور خدمات کی بنا پر وہ الاستاذ الجلیل کہلاتے تھے۔[2]

احمد لطفی کی زندگی پر افغانی و محمد عبدہ اور اس دور کے بعض دوسرے ادیبوں اور اہل قلم کے اثرات بھی مرتب ہوئے لیکن سیاسی میدان میں افغانی سے ان کا خاص تعلق رہا تاہم انہوں نے محمد عبدہ کی حکمت عملی اپنائی اور ان ہی کی طرح سیاسی آلائشوں اور خرابیوں سے تنگ آکر احمد لطفی سید نے علم و مطالعہ کو اپنا واحد شعار بنایا، وہ عبدہ کی طرح تدریجی انقلاب کے قائل تھے، وہ انگریزوں کے ساتھ گزر بسر کے مخالف نہیں تھے۔[3]

ان کو فلسفہ سے بھی دلچسپی تھی۔ عربی فلاسفہ میں ابن رشد، ابن سینا اور ابن حزم سے متاثر ہوئے، فرانسیسی مفکر فولتیر اور روسو کا بھی اثر قبول کیا اور انگریزی فلاسفہ میں جون ستوارت، ٹالسٹائے، مینیک سبنسر اور جوشاف تولون کے افکار و خیالات بھی انہیں پسند تھے۔[4] ارسطو کا فلسفہ بھی ان کی توجہ

---

[1] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر- ۶/۵۷ و ۵۹ [2] ایضاً- ۶/۶۲-۶۳ و الاعلام، ۱/۲۰۰ [3] ایضاً، ۶/۶۳ و احمد لطفی السید- ۳۷، و ادباء معاصرون- ص ۸۷- [4] احمد لطفی السید ص ۱۷۶- ۱۷۷۔

کام کرتا رہا اور انہوں نے ارسطو کی کتابوں علم الطبیعۃ السیاسۃ، الکون والفساد اور الاخلاق کو عربی میں منتقل کیا[1]۔

الجریدہ ان کے افکار کی ترجمانی کے لیے وقف تھا۔ المؤید، الاہرام اور المقطم میں بھی ان کے مقالات شایع ہوئے۔ محمد فرید کے مجلہ "الموسوعات" کی مجلس ادارت میں بھی شامل تھے۔ اس میں ان کا مشہور مقالہ "شخصیات الامۃ" شایع ہوا جس میں عربی زبان وحروف کی اصلاحات کا مسئلہ اٹھایا تاکہ نحو وصرف کے علم کے بغیر بھی لوگ اسے پڑھ سکیں، اسی خیال کے تحت انہوں نے عوامی زبان کے استعمال پر زور دیا[2]۔

سیاست ومعاشرت، تعلیم وتربیت اور لغت وغیرہ کو احمد لطفی نے اپنا موضوع بحث بنایا۔ ترجمے کے علاوہ احمد لطفی کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ البتہ ان کے مقالات کے چار مجموعے "صفحات مطویۃ من تاریخ الحرکۃ الاستقلالیۃ فی مصر"، "المنتخبات" (دو جلدیں)، "تأملات فی الفلسفۃ والادب والسیاسۃ والاجتماع"[3] اور مشکلۃ الحریات فی العالم العربی موجود ہیں۔

گو ۱۹۶۳ء میں احمد لطفی دار فانی سے رخصت ہو گئے[4] لیکن ان کے علمی و ادبی خدمات کے نقوش برابر قائم رہیں گے۔

احمد لطفی السید بحیثیت مقالہ نگار احمد لطفی نے الجریدہ اور مختلف رسائل میں بے شمار مقالات تحریر کیے، وہ آزادی کے حد درجہ دلدادہ تھے۔

۱؎ الاعلام ۱/۲۰۰ ۲؎ ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/۸۹-۹۱ والاتجاہات الوطنیہ۔ ۲/۳۷۲ ۳؎ الاعلام ۱/۲۰۰ ۴؎ احمد لطفی السید ۱۳۱۔

اور یہی ان کے مقالات پر چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کو "مفتاح النجاح" اور فضل وکمال کی معراج قرار دیا ہے، اس کے مقابلے میں وہ ہر چیز کو ہیچ سمجھتے تھے جس کو زندہ و بیدار قومیں ہر قسم کی قربانی دے کر حاصل کرتی ہیں اور غلامی کی زندگی کو اپنی ذلت وخواری کا باعث سمجھتی ہیں، ان کے نزدیک آزادی ہی کا نام زندگی ہے بلکہ وہ زندگی سے بھی اس کو قیمتی اور عزیز بتاتے ہیں، صحافت کا مقصد بھی حصول آزادی اور انکشاف حقیقت ہے[1]۔

احمد لطفی کے مقالات میں تین چیزیں بہت نمایاں ہیں (۱) عقل کو عظیم رہنما تصور کرنا (۲) مغربی تہذیب وتمدن کو قبیح ومعیوب نہ سمجھنا[2] (۳) دستور کے لیے آواز بلند کرنا[3]۔

ان کے مقالات کو تین حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ (۱) معاشرتی۔ (۲) سیاسی (۳) ادبی۔

معاشرتی مقالات جنگ عظیم کے بعد اخبارات میں الجریدہ نے مصری معاشرہ کی جانب زیادہ توجہ کی، وہ اس کے حامی تھے کہ ملازمت اور انتظامی ڈھانچوں میں اصلاً مصریوں ہی کو ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب مصر ان کا مسکن ہے تو اس میں صاحب مسکن ہی کا حکم چلنا چاہیے اور اقتدار بھی ان ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ احمد لطفی مصری ملازمین کے اس رویہ کی مذمت کرتے ہیں کہ وہ اپنے سربراہوں کے خوشامدی ہوتے ہیں، ملازمت کے تقاضوں اور ذمہ داریوں

۱؎ احمد لطفی السید، مشکلۃ الحریات فی العالم العربی، مطبعۃ الاجتہاد۔ بیروت (بدون تاریخ) ص ۹۰ ۲؎ احمد لطفی السید ص ۶۱ ۳؎ ادباء معاصرون۔ ص ۱۲ ۴؎ احمد لطفی السید ص ۱۹۷۔

کو پورا کرنے کے بجائے ان کی نظروں میں محبوب بننے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے لرزہ براندام رہتے ہیں، یہ لوگ اطاعت کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔

وہ مصری معاشرت کی اس خرابی کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ مصری قوم کا وقار و تشخص باقی نہیں رہا اور وہ غلامی کی زندگی کی خوگر ہوگئی ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ ذلت و نکبت سے دوچار ہے اور اس میں شعور و ادراک نہیں رہ گیا ہے، وہ اللہ کے بجائے صاحب اختیار لوگوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتی ہے[1]۔

مصری معاشرہ کو وہ نمود و نمایش میں ڈوبا ہوا بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اہل مصر کی خود غرضی بہت بڑھ گئی اس لیے وہ قومی مفاد کو سراسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔

احمد لطفی حکومت پر زور دیتے ہیں کہ وہ عوام کے لیے مفید قوانین وضع کرے۔ انہوں نے پارلیمنٹ کے نمائندوں کو مشورہ دیا کہ عوام کے جذبات و احساسات مجروح کرنے والے قوانین کی تشکیل نہ کریں بلکہ قوم کی آزادی و خودداری کا ہر حال میں لحاظ رکھیں۔

اپنے ایک مقالہ میں احمد لطفی نے بتایا کہ عوام کو فکر و عقیدہ اور تقریر و تحریر کی آزادی ملنی چاہیے۔ قانون ساز اداروں کو خیال رکھنا چاہیے کہ ان کے حقوق سلب نہ ہو جائیں[3]۔ قانون کی نظر میں سب کو برابر ہونا چاہیے اور عہدوں کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں برتا جانا چاہیے۔

آزادی کے سلسلے میں وہ مزید رقمطراز ہیں کہ جس طرح ہر فرد آزاد پیدا ہوا ہے

[1] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر۔ ۶/ ۱۲۶ و ما بعد بحوالہ الجریدہ [2] ایضاً ۶/ ۱۳۳ - ۱۳۷ [3] مشکلۃ الحریات فی العالم العربی۔ ص ۲۰-۲۱ و ما بعد۔

اسی طرح قومیں بھی آزاد پیدا ہوئی ہیں۔ جس طرح آزادی ہر فرد کا پیدائشی حق ہے اسی طرح وہ قوموں کا فطری حق ہے۔ اس لیے قانون سازوں کا فرض ہے کہ وہ ان کا یہ حق دینے میں کوتاہی سے کام نہ لیں، وہ عدلیہ کی آزادی کو بھی بہت اہم اور ضروری سمجھتے تھے۔

قانون سازی، قوانین کی تنفیذ اور عدل و انصاف کے اختیارات اگر کسی شخص یا گروہ کے ہاتھ میں آجائیں تو عوام ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہیں گے، اسی طرح اگر ان چیزوں پر کسی حکومت کا پورا غلبہ ہو جائے تو وہ تشدد کی سرپرستی کرے گی اور معاشرے کو تباہیوں کے دہانے پر لا کھڑا کرے گی۔ مصر میں ان تینوں چیزوں پر فرد واحد کا قبضہ ہے، اسی لیے یہاں آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے[1]۔ لوگوں کے حقوق پامال کیے جا رہے ہیں اور ہر طرف لاقانونیت کا دور دورہ ہے۔ قاضیوں کا تقرر، تبادلہ اور ان کی ترقی چونکہ حکومت کے ہاتھ میں ہے اس لیے ان کے فیصلے حکومت کی مرضی پر مبنی ہوتے ہیں، اس طرح عملاً ان کی آزادی سلب کر لی گئی ہے، اس لیے احمد لطفی نے عدالت کی آزادی کو ناگزیر بتایا ہے۔

وہ صحافت کی آزادی کے بھی علمبردار تھے، ان کے نزدیک یہ ملک و ملت کے لیے ایک عظیم نعمت ہے جس کو دور حاضر میں بڑی اہمیت حاصل ہوگئی ہے[2] اور یہ عام لوگوں کے احساسات و جذبات کی ترجمانی کا ایک بہتر وسیلہ بھی ہے حکومتوں کی طرح یہ ان کے لیے مسائل نہیں پیدا کرتی بشرطیکہ وہ تعمیری ہو۔

[1] مشکلۃ الحریات فی العالم العربی ص ۴۰-۴۱ و ما بعد [2] ایضاً ص ۶۳ و ۶۷

احمد لطفی نے ایک بار پارلیمانی نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ انسانی زندگی میں صحافت کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، وہ اس کی بنیادی ضرورت بن گئی ہے اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا بھی یہ ناگزیر عنصر ہے، اس لیے اس پر کسی طرح کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہیے۔ قانون ساز اداروں کو اس پر عائد کردہ تمام بندشیں اٹھالینا چاہیے کیونکہ اس کی وجہ سے رائے عامہ میں ہم آہنگی پیدا ہوگی اور اس سے مختلف سطح پر معاشرہ کی ترقی ہوگی[1]

مصر میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے میں بھی احمد لطفی نے بڑی جدوجہد کی، اس میدان میں وہ عبدہ کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں[2] وہ روسو کے اس خیال سے متفق تھے کہ انسان بہترین خصوصیات کا حامل ہوتا ہے، جن کی بہتر طور پر تربیت کرکے ان کو جلا دینے کی ضرورت ہے۔ کسی قوم کی یہ بڑی اہم ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی مثالی تربیت کرے۔ مناسب اور اچھی تعلیم و تربیت ہی قوم کے مختلف طبقوں میں ربط و ہم آہنگی اور وحدت پیدا کی جاسکتی ہے۔

آگے لکھتے ہیں کہ تعلیمی ادارے اسی وقت پوری طرح نفع بخش ثابت ہوسکتے ہیں، جب وہ حکومت کی دسترس سے آزاد ہوں اور ان کے نصاب میں حکومت کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔ اس وقت جو تعلیمی پالیسی تعلیمی اداروں میں کارفرما ہے وہ گزشتہ حکومتوں کی پالیسی سے بھی بدتر ہے[3] .... حکومت اپنی آسانی کے لیے تمام مدارس میں ایک ہی نصاب رائج کرتی ہے اور تمام طلبہ کو وہی

[1] مشکلۃ الحریات فی العالم العربی۔ ص ۶۸ و ۷۲ [2] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/۴۵، ۱۴۳ و ۱۴۶ [3] مشکلۃ الحریات فی العالم العربی، ص ۴۹۔

پڑھنے کے لیے مجبور کرتی ہے، یہ چیز ذہین طالب علموں کے لیے سخت مضر ہے[1]

حکومت کے مقرر کردہ اساتذہ سے طلبہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے، انکی تنخواہیں بیش قرار ہوتی ہیں اور یہ اپنے کو حاکم وقت سے کمتر خیال نہیں کرتے، سرکاری مدارس کے بالمقابل "الجمعیات المنبریہ" کے تحت چلنے والے مدارس زیادہ مفید خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جبکہ ان کے اساتذہ بہت قلیل مشاہرہ پاتے ہیں۔ یہاں کے طلبہ کے نتائج بھی سرکاری مدارس کے طلبہ سے بہتر ہوتے ہیں۔ دوسرے غیر سرکاری ادارے بھی سرکاری اداروں سے بہتر ہوتے ہیں اسی لیے وہ سرکاری تعلیمی اداروں کو عوام کو دیے جانے کے حق میں ہیں۔

سرکاری تعلیمی اداروں کا فاسد نظام دیکھ کر احمد لطفی چیخ اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں ایسے تعلیمی نظام کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ انگریزوں کے جاری کردہ نصاب تعلیم کو بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، ان کے خیال میں تعلیمی اداروں کی باگ ڈور ایسے ہاتھوں میں ہونی چاہیے جو علمی و تعلیمی حیثیت سے بہت ممتاز ہوں[2]

آزادئ تقریر کو بھی وہ شخصی آزادی کا ایک عظیم مظہر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ افکار و خیالات کی اشاعت کا خاص ذریعہ ہے، اس لیے اس پر کسی قسم کی قدغن نہیں لگانا چاہیے، قدیم زمانے میں خطابت کو وہی درجہ حاصل تھا جو آج صحافت کو حاصل ہوگیا ہے، مگر آج خطابت اور تقریر کی آزادی بھی سلب کرلی گئی ہے، جس کی وجہ سے اچھے خطیبوں کی زبانیں گنگ ہوگئی ہیں[3]

سیاسی مقالات | الجریدہ کا اجرا اس وقت ہوا جب اللواء اور المؤید دم توڑ

[1] مشکلۃ الحریات فی العالم العربی۔ ص ۵۰ [2] ایضاً ص ۵۱ و مابعد [3] ایضاً ص ۵۷ و مابعد

چکے تھے اور جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔

یہ پہلے گزر چکا ہے کہ احمد لطفی کو تدریج پسند تھی اس لیے الجریدہ میں بھی ہمیں اعتدال اور متانت نظر آتی ہے، احمد لطفی کے خیال میں وہ انقلاب کامیاب اور دیرپا نہیں ہوتا جس کی بنیاد ظلم وتشدد پر ہوتی ہے اور اگر کامیاب بھی ہوجائے تو ملک میں انارکی پھیل جاتی ہے، اس وقت تمام مصری اخبارات حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے اور لارڈ کرومر کی داستان مظالم بیان کرنے میں مصروف تھے[1] مگر احمد لطفی کے خیال میں مسائل کے حل کا یہ طریقہ مناسب نہیں تھا، ان کے نزدیک ان کے سدباب کی تین صورتیں تھیں۔ (۱) بہتر طریقہ انتخاب (۲) مجلس شوریٰ کی تجدید (۳) اور احساس ذمہ داری۔

احمد لطفی نے پارلیمانی مجلس سے مطالبہ کیا کہ وہ مجلس شوریٰ کو قانون سازی کا اختیار دے۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں اسے یہ اختیار مل گیا۔

"وفاق" کا مسئلہ زیر بحث آیا تو مصری قوم دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک اس کی حمایت اور دوسری اس کی مخالفت کرتی تھی۔ الجریدہ نے خود کو اس بحث سے الگ رکھا تاکہ اسکو قوم خدیو۔ برطانیہ اور مصری پارٹیوں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن جب احمد لطفی کو اس کا احساس ہوا کہ وفاق سے مصری قوم کو شدید نقصان ہوگا اور اس کا سارا فائدہ انگریزوں کو پہنچ رہا ہے تو انہوں نے اس کی جم کر مخالفت کی[2]۔

حکومت کی کارکردگی اور مصری سیاست سے وہ سخت غیر مطمئن تھے، انہوں نے

---

[1] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/ ۱۹ و ۱۱۱ [2] ایضاً ۶/ ۱۱۳ - وما بعد۔

وزراء کو تلقین کی کہ وہ قوم کے مفاد کا خیال رکھیں اور وزارت کے لالچ میں اسے نظر انداز نہ کریں[1]۔

مقالۃ "الاستقلال" میں احمد لطفی نے انگریزوں کے اس استحصال کا ذکر کیا ہے جو وہ مصریوں کا کر رہے تھے، اس سلسلہ میں نہر سوئیز بند کرنے، سوڈانی کمپنیوں کو تعاون دینے اور مصر میں طبقاتی نظام رائج کرنے کا ذکر کرتے ہیں، وہ مصری حکومت کے بارے میں بتاتے ہیں کہ یہ شخصی نہیں ہے بلکہ خدیو اس کے وزراء اور برطانوی نمائندوں اور مشیروں پر مشتمل ہے اور یہ سب عوام کے سامنے جوابدہ ہیں، وہ حکومت کی خرابیوں کی بھی نشاندہی کرتے ہیں[2]۔

احمد لطفی کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ وہ انگریزوں کے بہت سے غلط کاموں کی بھی تاویل کرتے ہیں اور لارڈ کرومر کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہیں کرتے اور اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں۔

"۱۸۸۹ء میں جب لارڈ کرومر کو مصر کی مالیات کا نگراں بنایا گیا تو اس میں اس نے پوری مہارت دکھائی، اپنی اسی صلاحیت کے نتیجہ میں اسے ہندوستانی مجلس مالیات کا ممبر بھی بنایا گیا جس کا بجٹ بہت خسارے سے چل رہا تھا۔ اس نے مصر کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے آبپاشی کا نظام بہتر بنایا۔ اس کے علاوہ اس نے کسٹم ہاؤس، ریلوے لائن، ڈاکخانوں اور درآمدات کے دیگر ذرائع پر توجہ دی اور سود جیسی لعنت سے مصری کسانوں کو نجات

---

[1] احمد لطفی السید۔ ص ۱۲۰ و الجریدہ ۳۰ اگست ۱۹۰۸ء بحوالہ ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/ ۱۶۱ [2] احمد لطفی السید۔ صفحات مطویۃ من تاریخ الحرکۃ الاستقلالیۃ فی مصر، مصر ۱۹۴۶ء۔ ص ۱۲۲ وما بعد۔

دلائی۔ اس نے زرعی بینک بھی قائم کیے جس سے کسانوں کا کافی بھلا ہوا۔

احمد لطفی اسے ایک سیاسی مدبر، اچھا فوجی اور معاملہ فہم بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں خود اعتمادی اور ثابت قدمی تھی جس کی وجہ سے مصری معاملات میں اس کی رائے باوزن سمجھی جاتی تھی[1]

انتخاب کو جمہوریت اور شہنشاہیت کے درمیان کی چیز بتاتے ہیں یہ قوم کے فوائد ومصالح کا ضامن اور قول وعمل کے تضاد کو ختم کرنے والا ہوتا ہے، انہوں نے اس کے شرائط بھی بیان کیے ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ کن لوگوں کو اس میں حصہ لینا چاہیے[2]

مجلس انتظامیہ کے باب میں اس کے مفید و موثر ہونے کی صورتیں بیان کی ہیں اور اس کے فرائض یہ بتائے ہیں کہ آبی وسائل کو بہتر بنائے، فلاح عام پر توجہ دے، تعلیم کو عام کرے، عوام اور حکومت کے تعلقات کو خوشگوار بنائے اور دوسرے اصلاحات کو مدنظر رکھے۔

احمد لطفی نے مجلس انتظامیہ کی تشکیل میں چار چیزوں کے خیال رکھنے پر زور دیا ہے۔ ارکین کی تعداد، منشور، مدت انتخاب اور دائرہ اختیارات۔ تاکہ اسکی خود سری کا امکان باقی نہ رہے[3]

شخصی وانفرادی آزادی اور دستور کے تقدس کے لیے انہوں نے ہمیشہ آواز بلند کی۔ وزارت کو اقتدار کے غلط استعمال اور شخصی آزادی کو نقصان

[1] صفحات مطویۃ من تاریخ الحرکۃ الاستقلالیہ فی مصر ص ۷۰ وما بعد [2] ایضاً ص ۱۹۹، ۲۰۰ و ۲۰۱ [3] ایضاً ص ۱۹۹ و ۲۰۷۔

پہنچانے سے روکا اور بتایا کہ شریف پاشا کی وزارت نے ہمیشہ قومی مفاد کو ترجیح دی اور جب انہیں قوم کے نقصان کا اندیشہ لاحق ہوا تو وہ وزارت سے مستعفی ہوگئے۔ اور خدیو اور انگریزوں کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہ کی کیونکہ دونوں کی پالیسی قومی مفاد کے برعکس تھی مگر آج مصری وزارت پوری طرح سے برطانیہ کی کاسہ لیس اور قوم کے مفاد سے بے پرواہ ہوگئی ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ وزارت کا احتساب ضروری ہے، تاہم اسے حکومت کے اثر سے آزاد ہونا چاہیے تاکہ وہ قوم کو آزادی وترقی سے ہمکنار کرسکے[1]

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ احمد لطفی کے سیاسی افکار غور وفکر پر مبنی اور سنجیدہ تھے۔

عربی زبان وادب

الجریدہ ساٹھ سال (۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۵ء) تک جاری رہا اس عرصہ میں احمد لطفی نے عربی زبان وادب کے بارے میں متعدد مقالات تحریر کیے، وہ عربی زبان کی اصلاح وارتقاء کے لیے فکرمند تھے کیونکہ اس سے مصریوں کا مستقبل، ان کی زندگی اور ان کی تاریخ وابستہ ہے۔ زبان کے معاملہ میں وہ مصریوں کے حساس ہونے کا ذکر کرتے ہیں کہ برطانوی خبررساں ایجنسی کی جانب سے کوئی تقریر، منشور یا کتابچہ انگریزی اور فرانسیسی زبان کے ساتھ اگر عربی میں بھی ہوتا ہے تو یہ مصری عوام کے لیے قابل قبول ہوتا ہے، لیکن یہی چیزیں اگر صرف غیر ملکی زبانوں میں ہوں تو اس پر وہ سخت برہمی اور اضطراب

[1] مشکلۃ الحریات فی العالم العربی۔ ص ۴۲ و صفحات مطویۃ من تاریخ الحرکۃ الاستقلالیہ فی مصر۔ ص ۲۳۸ و ۲۴۸۔

کا اظہار کرتے ہیں[1]

احمد لطفی نے بتایا کہ روزمرہ کی بول چال اور تصنیفی زبان میں فرق ہونا چاہیے، وہ مجلسی گفتگو میں عوامی زبان کے استعمال پر زور دیتے،[1] لیکن تحریر میں اس کے بجائے علمی فصیح اور بلیغ زبان کے استعمال پر زور دیتے تھے، انہوں نے "تمصیر اللغۃ العربیۃ" کے عنوان سے سات مقالات تحریر کرکے یہ بتایا کہ عربی زبان کو مصری رنگ دیا جانا چاہیے، ان کے اس نقطہ نظر کی شدید مخالفت کی گئی اور مصطفیٰ صادق الرافعی نے اسے ایک باطل خیال قرار دیا، ان کے نزدیک عربی زبان کی بنیاد اسلام اور قرآن مجید کی زبان پر ہونی چاہیے، اسے مصری قالب میں ڈھالنے کے معنی یہ ہیں اسلام کو مصری قالب میں ڈھالا جائے جو ایک خطرناک اقدام ہے[2]

احمد لطفی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ فصیح و بلیغ عربی کے بجائے عوامی زبان کے استعمال پر زور دیتے ہیں، لیکن پہلے بتایا جاچکا ہے کہ عوامی زبان کا استعمال وہ عام لوگوں کے لیے بہتر سمجھتے تھے، اہل علم و اصحاب قلم کو وہ فصیح زبان ہی لکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان کے اس خیال کی تائید ہیکل، مازنی، طہٰ حسین، عقاد، احمد امین اور توفیق الحکیم نے بھی کی ہے[3]

گو احمد لطفی نے خود ادبی اور تنقیدی مقالات نہیں لکھے تاہم الجریدہ میں اس پر بے شمار مقالات شایع ہوئے اور تنقید نگاری کو عربی زبان میں پہلی بار متعارف کرانے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے[4]

[1] الجریدہ، ۲۵ فروری-۲۰ فروری سنہ ۱۹۱۲ء، بحوالہ ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/۱۶۰-۱۶۱
[2] الاستجابات الوطنیۃ ۲/۳۷۲ [3] المعارک الادبیہ ص ۳۷-۴۴ و ۸۲ [4] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/۱۶۲ و مابعد۔

اسلوب

احمد لطفی کو زبان پر پوری قدرت تھی۔ ان کی تحریریں ادبی خوبیوں سے معمور ہوتی ہیں اور ان میں بڑی جاذبیت، شگفتگی اور رعنائی ہوتی ہے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے جملے نہایت برجستہ، بے ساختہ اور معنویت سے پُر ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"ان حب الوطن کحب العائلۃ وککل عاطفۃ من العواطف وانما اساسھا المنفعۃ، فعلی المنفعۃ یبنی کل احساس وکل عمل وعلی المنفعۃ المتبادلۃ لقوم الجمعیۃ الانسانیۃ فالفرد الذی لا یجد فی الجمعیۃ الانسانیۃ عزماً یدفعہ فی غیر مقابل تحدید من الحریۃ الطبیعیۃ اقتضتہ ضرورۃ الاجتماع ام لم تقتضہ وتعریض النفس الی خطر الحروب دفاعاً عن السلطان او عن الاوطان وکید بکبد الشارع المطلق کتفضیل بعض الطبقات علی بعض واکراہ دائم علی اتباع لوائح البولیس ونظامات الجمعیۃ او الحکومۃ وضغط مستمر یلجی الفرد الی ان لا یلبس ولا یطعم ولا یمشی۔ بل لا یفتکر الا بالاتفاق مع جمہور الامۃ"[1]

ان کی تحریریں تیزی اور اشتعال سے خالی اور تفکر و تدبر کا نتیجہ ہوتی ہیں جن میں جدت و تازگی کے ساتھ عالمانہ انداز بھی ہوتا ہے، وہ عبارت آرائی اور لفاظی سے پرہیز کرتے تھے[2]

[1] مشکلۃ الحریات فی العالم العربی ص ۳۷-۳۸ [2] المحافظۃ والتجدید فی النثر العربی ص ۱۸۵ نیز دیکھئے احمد لطفی السید ص ۱۵ و ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/۱۹۱ و ۱۹۲۔

احمد لطفی چونکہ فلسفیانہ ذہن کے مالک اور قانون کے ماہر اور سیاستدان تھے، انہوں نے مختلف زبانوں کے ادب و ثقافت کا مطالعہ بھی کیا تھا اور اچھے ادیب و انشاپرداز تھے اس لیے جس طرح کا موضوع ہوتا تھا وہ اسی طرح کا اسلوب بھی اختیار کرتے تھے، زبان و الفاظ کا انتخاب بھی موضوع کے لحاظ سے کرتے تھے۔

خلوص و صداقت نے بھی ان کی تحریروں میں جان ڈال دیا تھا۔ وہ ہر بات کو تحلیل و تجزیہ کرکے پیش کرتے تھے، ان کے اسلوب پر یورپین اسلوب کی چھاپ بھی تھی مگر وہ غیر ملکی زبانوں کے الفاظ بھی استعمال کرتے تھے تو انہیں خالص مصری ترکیب و انداز کا رنگ دے دیتے تھے۔ جیسے ماکینہ (MACKINE) مودۃ (FASHION) اور اوتوموبیل (AUTOMOBILE) وغیرہ۔ کو اپنے مقالات میں اس قدر استعمال کیا ہے کہ انہوں نے بالکل عربی شکل اختیار کرلی ہے۔ اسی طرح ان کی تحریروں میں مصری ترکیبوں کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ مثلاً "لم تبرھن حکومتنا الاستبدادیۃ الی الآن علی انھا ترید مساعدتنا علی وقتنا الاجتماعی والاقتصادی الخ"، اس میں "مساعدتنا علی وقتنا"، خالص مصری ترکیب ہے۔ جس کا فصیح عربی سے کوئی تعلق نہیں [1]۔

ان کی تحریروں کی ایک خصوصیت ہلکی ظرافت بھی ہے، مگر اس میں بھی وہ سطحیت کو آنے نہیں دیتے، ان کی تنقید و تردید مبالغہ سے خالی ہوتی ہے، تحریر میں خوداعتمادی ہوتی ہے، اس طرح ان کے اسلوب میں بڑا تنوع ہوتا ہے۔

[1] ادب المقالۃ الصحفیۃ فی مصر ۶/۱۹۶ وما بعد۔

دارالمصنفین کے اردو مخطوطات

از

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

خوش بختی کہ رابطۂ ادب اسلامی ہند کے علمی مذاکرے میں شرکت کی دعوت پر اعظم گڈھ جانا ہوا۔ یہیں علامہ شبلی نعمانیؒ کا قائم کردہ دارالمصنفین اپنی تاریخی و تہذیبی شان و شوکت کے ساتھ سربلند کھڑا ہے۔ اسی کے زیر اہتمام یہ سہ روزہ مذاکرہ ہوا تھا، اسکا وسیع کتب خانہ اور نادر و نایاب قلمی کتابوں کا ذخیرہ اصحاب علم و ادب کے لیے سرمایۂ نشاط بنا ہوا ہے، بزرگوں کی آخری آرامگاہیں عہد ماضی کو یک لخت آنکھوں کے سامنے لے آتی ہیں، یہ تمام چیزیں دیکھ کر دل پکار اٹھا۔ آج کے ناگفتہ بہ ہمت شکن حالات میں دارالمصنفین کی یہ پُربہار رونق اور حیات آفریں فضا ہے تو دور شبلیؒ میں اس کی رعنائی، دلنوازی، فرحت و انبساط پروری اور نشاط آفرینی کا کیا حال ہوگا؛ بارالہٰ! اس عظیم ہستی کو کروٹ کروٹ سکون و راحت پہنچا اور اس کی آخری آرامگاہ کو نور سے معمور فرمادے جس نے قوم کی فلاح و صلاح کے لیے اتنا قیمتی سرمایہ چھوڑا۔

یہ علمی مذاکرہ تین ہی دن کا تھا، طبیعت سیر نہیں ہوئی تھی۔ اردو کے قلمی نسخے اور چند کتابیں دیکھنے اور کتب خانے سے استفادہ کے علاوہ اپنے عزیز شاگرد نذیر احمد قریشی کی رہنمائی کے لیے۔ جو دارالمصنفین ہی پر اپنا تحقیقی مقالہ امراوتی یونیورسٹی کے لیے

لکھ رہے ہیں چند روز مزید قیام کیا۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کو جب علم ہوا تو انھوں نے دارالمصنفین کے مہمان خانے میں رہائش و آرام اور لذتِ کام و دہن کے ساتھ کتابوں کا بھی انتظام کر دیا نیز قلمی نسخے بھی پڑھنے کے لیے عنایت فرما دیے۔ انہی قلمی نسخوں کے تعارف کے لیے یہ سطور قلمبند کی جا رہی ہیں۔

۱۔ تفسیر مرتضوی نمبر ۱ ۸/۶۲ /۸۰۸

کتب خانے کی فہرست میں اس کا نام "مثنوی منظوم" لکھا گیا ہے لیکن بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے پتہ چلا کہ یہ مثنوی نہیں بلکہ قرآن حکیم کے تیسویں پارہ کا منظوم ترجمہ ہے مگر ناقص الطرفین ہونے کی وجہ سے مترجم شاعر کے نام اور سنہ تصنیف وغیرہ کا پتہ نہیں چل سکا، حسن اتفاق سے میرے ذاتی کتب خانے میں مطبع طبی کلکتہ سے ۱۲۵۹ھ (۱۸۴۳ء) میں طبع شدہ تفسیر مرتضوی کا ایک نسخہ موجود ہے۔ دونوں کا مقابلہ کرنے پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ زیر نظر قلمی نسخہ دراصل "تفسیر مرتضوی" ہی کا حصہ ہے۔

اس تفسیر کے نسخے ہند و پاک کے بعض کتب خانوں میں موجود ہیں۔ رضا لائبریری رامپور میں ۲۹ ویں و تیسویں پارے کے مخطوطے و نیز مطبع طبی کلکتہ سے طبع شدہ نسخہ بھی موجود ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد میں بھی تیسویں پارہ کا مخطوطہ محفوظ ہے۔ مولانا امتیاز علی عرشی اور زور مرحوم نے اپنے کتب خانوں کی وضاحتی فہارس میں تفسیر مرتضوی اور اس کے مترجم شاعر کا تعارف کرایا ہے اسی تفسیر کا ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی ہے۔ پروفیسر محمد مسعود احمد نے آل پاکستان اسلامک اسٹڈیز کانفرنس منعقدہ سندھ حیدرآباد جنوری

۱۹۶۳ء میں پڑھے گئے اپنے مقالے "بارہویں صدی ہجری میں قرآن پاک کے اردو تراجم اور تفاسیر" میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور کے شیرانی سیکشن میں محفوظ اسی تفسیر کے ایک نسخہ کا ذکر کیا ہے۔

تفسیر مرتضوی کو اردو ادب میں اس بنا پر اہمیت حاصل ہے کہ یہ پہلی منظوم تفسیرِ قرآن ہے، جو قرآن کے پہلے مکمل ترجمہ و تفسیر موضح القرآن (۹۱-۱۷۹۰ء/۱۲۰۵ھ) سے دس سال قبل یعنی ۱۷۸۰ء/۱۱۹۴ھ) میں تالیف ہوئی۔ لاہور والے نسخے میں سنہ تالیف کے متعلق شاعر نے لکھا ہے ؎

سنہ ہجراں ان دنوں تھا جان لے ۔۔۔ یک ہزار اور ایک سو چورانوے
۱۱۹۴ھ

اس تفسیر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مقامی اثرات صنمیاتی روایات اور ہندو اسطوری خرافات سے پاک و صاف ہے، گویا وہابی تحریک کی زبردست چھاپ اس تفسیر پر دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ ان ہی ایام میں لکھی گئیں دیگر تفاسیر مثلاً "تفسیر تنزیل"، "تفسیر مرادی" اور "تفسیر جز و قرآن" (آئندہ اس کا تعارف کرایا جائے گا) وغیرہ میں ہندوی روایات بکثرت ملتی ہیں۔

تفسیر مرتضوی کے مترجم شاعر شاہ تیمور کے خلف صدق غلام مرتضیٰ متخلص بہ مجنوں ہیں۔ امتیاز علی عرشی نے تذکرۂ گلزار ابراہیم، گلشن سخن، مجموعہ نغز، گلشن بے خار اور طبقات شعرائے ہند کے حوالوں سے ان کا یہ نام اور وطن سہسرام کا ایک گاؤں بتایا ہے جہاں سے ترک وطن کرکے وہ الٰہ آباد میں آبسے تھے، یہ تفسیر شاہ عالم ثانی (م ۱۸۰۶ء/۱۲۲۱ھ) کے دور میں لکھی گئی تھی۔ زیر نظر تفسیر کا نسخہ ناقص الطرفین ہونے کی وجہ سے سنہ و سببِ تالیف، مدح شاہ اور ترقیمہ وغیرہ

خالی ہے۔ تاحال تفسیر مرتضوی کے صرف دو پاروں (انتیس اور تیس) کا ترجمہ ہی مل سکا ہے۔ پتہ نہیں نذر مرحوم نے کس بنیاد پر یہ قیاس کر لیا ہے کہ مجنوں نے پورے قرآن شریف کا منظوم ترجمہ کر لیا تھا۔ البتہ رام پور کے کتب خانے میں موجود مجنوں کے فارسی منظوم ترجمۂ قرآن اور سورۂ رحمٰن کے اردو منظوم ترجمہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہیں قرآن کا منظوم ترجمہ کرنے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ ندرم نے اپنے مضمون "قرآن کا پہلا منظوم ترجمہ" مطبوعہ "ہماری زبان" دہلی (۸۱-۱۹۸۰ء) میں تفسیر مرتضوی کا جائزہ لے کر اس کی خصوصیات دکھائی ہیں، یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ دارالمصنفین کے نسخہ کو اہم بنا دینے والی باتیں حسب ذیل ہیں:

(ا) یہ قدیم املا کا حامل مخطوطہ ہے۔ کاتب نے (۱) "گ" کو بلا مرکز دوئم ہر جگہ لکھا ہے۔ (۲) "چ" کے تین نقطوں کے بجائے ایک ہی نقطہ لکھنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ (۳) "اُس" اور "اُن" ضمائر اشارہ کو "و" زائد سے لکھا گیا ہے (۴) بجائے "ہوں گے" کے "ہونگے" میر و سودا کی زبان کا لفظ استعمال کیا گیا (۵) "نے" کو اکثر اشعار میں حذف کر دیا گیا جیسے "میں سنا" (۶) حرف جر "سے" کی جگہ بعض اشعار میں "پر" کا استعمال ہوا ہے مثلاً ع "جب کہ ہوتا ہے کچھ اون پر خطاب"۔

(ب) بعض مصرعے یا ان کے الفاظ کو کاٹ چھانٹ کر حاشیہ میں انکی تصحیح کر دی گئی ہے۔ مثلاً "والنازعات" کے ذیل میں ایک جگہ مصرع یوں لکھا گیا ہے ع "بھی تفاسیروں میں اکثر کر نظر"

لیکن خط کشیدہ الفاظ کو کاٹ کر حاشیہ میں "میں دیکھو اے بینہ صاف" لکھا ہے۔ مطبوعہ نسخہ میں اصل مصرع حاشیہ میں درج مصرع کے مطابق ہی ہے

ع "بھی تفاسیروں میں دیکھو اے بینہ صاف"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

(ج) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الآیۃ کے حاشیہ میں یہ عبارت ملتی ہے۔ "تاریخ ہندی سمبت ۱۸۶۵

بمطابق ۹ جمادی الاول سنہ ۱۲۸۲ھ

دموافق ف ۱۲۹۳ بوقت ۵ گھڑی شب کے لڑکا احمد حسین کا"

مذکورہ عبارت اور مخطوطہ کی عبارت میں معمولی فرق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مالک مخطوطہ نے اپنے گھر تولد ہوئے بچے کی تاریخ پیدائش لکھی ہو۔ تفسیر مرتضوی کے وہ نسخے جنھیں کاتب شیخ شمس الدین عرف شیخ میڈو ولد شیخ ثناء اللہ ساکن قصبہ چندوس نے تحریر کیے ہیں، ان میں تینوں سنین بالالتزام مرقوم ہوئے ہیں (دیکھیے رضا لائبریری کے تفسیر مرتضوی کے مخطوطات)

زیر نظر مخطوطہ کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے ؎

صور میں اوس دن بام کبریا　　نفخۂ ثانیہ پھونکا جای کا

کہتے ہیں ہے صور جیوں شاخ کلاں　　حضرت اسرافیل پھونکے کا دہاں

خاتمہ۔

اَلْخَنَّاسِ

چھپنے والا کرنے والا ہے فرار　　بندہ جب کرتا ہے ذکر کردگار

اس کے بعد کے صفحات غائب ہیں۔ جس سے ترقیمہ کا پتہ نہ چل سکا۔

بہرحال تفسیر مرتضوی کے چند اہم نسخوں میں دارالمصنفین کا یہ نسخہ نہایت اہمیت

کا حامل ہے۔

۲۔ تفسیر جزء قرآن ناتمام نمبر ۲۹۷/۱۲۲۷ (۹)

یہ قرآن کی سورہ "ن" اور اس کے ماقبل کی سورتوں کی تفسیر ہے۔ ناقص الاول و آخر ہونے کی وجہ سے اس کے مفسر، کاتب نیز سنہ تصنیف کا علم نہ ہو سکا۔ کاغذ بہت بوسیدہ ہو چکا ہے۔ بہ لحاظ زبان و املا یہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔

مفسر نے ہر آیت کے ذیل میں ترجمہ و تفسیر لکھنے کا التزام کیا ہے ایک صفحہ پر مصنف نے "علماؤں کے سوال اور جواب" کی ذیلی سرخی ڈالی ہے۔ جمع الجمع کی یہ بھونڈی مثال ہے۔ سورہ "نون" کے متعلق مصنف نے لکھا ہے:

"اس میں باون آئتیں اور دو سو بیس کلمے ہیں اور تین سو چھ حرف ہیں پہلی آئتیں اس سورہ کی مکی ہیں، لیکن بعضے آیتوں میں اختلاف ہے کہ مکی ہیں یا مدنی، اور اس شمار میں اس کی آئتیں پچاس میں بلا خلاف اور ۵۲ ہونے میں اختلاف ہے"

یہاں "اختلاف" کی ضد "بلا خلاف" بھی قابل توجہ ہے۔ مصنف نے "وحی" کو مذکر لکھا ہے۔ چنانچہ سورہ "ن" کے شان نزول کے متعلق لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

"جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلعت نبوت سے سرفراز ہوئے اور آپ پر وحی آنا شروع ہوا"

مصنف نے حروف مقطعات کے نون کے معنی مچھلی لیے ہیں اور استدلال یہ کیا ہے کہ اس سورہ میں صاحب الحوت حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"اس حرف نون کی تفسیر میں جو اس سورہ کے اول میں واقع ہے اور اس سورہ کے نام بھی وہی ہے مفسروں نے بہوت (ابہت؟) اختلاف کیا ہے۔۔۔۔ اس نون سے مراد وہ مچھلی ہے جس کی پیٹھ پہ ساری زمین ہے اور اوس کا نام بہوت بالبوتا یا "بلہوت بالوتیا" ہے"

تعجب ہے کہ اس ضعیف بلکہ موضوع روایت کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور قتادہ وغیرہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ اس قسم کی خرافات پر مبنی روایت کا اسلام سے کیا تعلق؟

ایسی ہی ایک اساطیری روایت یہ بھی لکھی ہے کہ "ایک فرشتہ اس زمین کو تھامے ہوئے ہے اور وہ فرشتہ ایک بیل کے کوہان پہ پاؤں رکھے ہوئے ہے اس بیل کے چالیس ہزار سینگ اور اتنے ہی پاؤں ہیں۔ اوس بیل کے نتھنے کھاری دریا کے اندر ہیں۔ جب وہ دُم ہلاتا ہے تو دریا میں جوار بھاٹا آجاتا ہے وغیرہ"۔ مذکورہ روایت ہمارے برادران وطن کے یہاں موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے مصنف نے وہیں سے خوشہ چینی کی ہے۔ ہندوستان میں ولی اللہی تحریک نے دین میں در آئی ایسی خرافات و موضوع روایات کا خاتمہ کیا جس کے لیے قرآن کے صحیح ترین ترجمہ اور تفسیر پر خصوصیت سے توجہ دی گئی۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ اور ان کے اخلاف ثلاثہ نے اردو میں قرآن حکیم کے تراجم کیے۔ انگریزوں نے اس تحریک کے جو سید احمد شہیدؒ اور حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کے دور میں خوب ترقی پاگئی تھی کے خاتمہ کے لیے اس کے بالمقابل ایک نیا گروہ تیار کیا تھا جو مقامی اثرات سے متاثر اذہان کو یہاں کی صنمیاتی روایات کو اسلامی تعلیمات کا رنگ دے کر

پیش کرتا تھا۔ زیر نظر تفسیر غالباً ایسے ہی ذہن کی اپج ہے۔ مصنف مذکور نے بعض الفاظ کے بنگالی اور مرہٹی متبادل الفاظ بھی بتائے ہیں۔ مثلاً

اصل	بنگالی	بمبئی (مرہٹی)
مد	جوار	بھرتی
جزر	بھاتا	ادت

۳۔ روضۃ الشہداء نمبر ۸۱/۸۰۸/۶۱

کتب خانے کی فہرست میں اس کا نام "مرثیہ کربلا" بتایا گیا ہے جو صحیح نہیں، یہ ناقص الطرفین مخطوطہ ولی ویلوری ثم ارکاٹی کی تصنیف ہے اور ملا حسین واعظ الکاشفی کی مشہور تصنیف روضۃ الشہداء (فارسی) کا منظوم ترجمہ ہے۔ دکن میں نوسرہار از اشرف، کربل کتھا اور یہ کتاب ادبی و مذہبی لحاظ سے بڑی اہم خیال کی جاتی ہیں۔ زور مرحوم نے تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول (صفحات ۵۸ تا ۶۰) میں اس تصنیف اور اس کے مصنف کا تعارف کرایا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے کتب خانے میں روضۃ الشہداء کے پانچ نسخے ہیں جن میں تاریخ تصنیف شاعر نے یوں بیان کی ہے ؎

کیا ہوں ختم یو درد کا قال — اگیارہ سو پہ تھا سینتیسواں سال (۱۱۳۷ھ)

نصیر الدین ہاشمی نے یوروپ کے کتب خانوں میں اس کے تین قلمی نسخوں اور پروفیسر سروری نے سالار جنگ میوزیم اور عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانوں میں موجود ۸ نسخوں کی اطلاع بہم پہنچائی ہے، لیکن ان میں سال تصنیف ۱۱۱۹ھ، سنہ ۱۱۰۹ھ اور سنہ ۱۱۳۰ھ بتلائی گئی ہے۔ مادۂ تاریخ چونکہ لفظی ترتیب میں ہے اسلیے التباس

کی گنجائش صرف "انیسواں" "انتیسواں یا سینتیسواں" میں ہو سکتی ہے لیکن "نواں" اور "نبواں" یہ دونوں لفظ تو مصرع کے وزن ہی کو مجروح کر دیتے ہیں۔ اس لیے سروری مرحوم کی نشاندہی کی ہوئی ۱۱۰۹ھ اور سنہ ۱۱۳۰ھ تاریخیں محل نظر ہیں۔ میرے پاس موجود روضۃ الشہداء کے مطبوعہ نسخے (طبع ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۳ء) میں تاریخ تصنیف کا شعر یوں مرقوم ہے

کیا ہوں ختم جب یہ درد کا قال — اگیارہ سو پہ تھا انیسواں سال (۱۱۱۹ھ)

روضۃ الشہداء کا شاعر ولی ویلور (علاقہ مدراس) کا رہنے والا تھا۔ یہ ولی دکنی گجراتی نہیں ہے۔ زور مرحوم نے اسے چٹ پیٹھ کا جاگیر دار، حراست خاں صوبیدار اور عبد المجید خاں قلعدار کا متوسل بتایا ہے۔ یہ کتاب اس کی کہنہ مشقی کا ثبوت ہے۔ اتنے بڑے شاعر کو ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنی کتاب "تاریخ ادب اردو" میں سرسری طور پر متعارف کرایا ہے۔ ولی ویلوری کی ایک اور تصنیف "رتن پدم" بھی مشہور ہے۔ روضۃ الشہداء ۱۰ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر حضرت زین العابدین بن علی کی جنگ تک کے واقعات درج ہیں، زیر نظر مخطوطہ کی ابتدا اس طرح ہوئی ہے۔

بہتر سوئی تھی طفلاں یو سوتا بہار — او طفلاں میں ہوا ایک طفل بیدار
انے دسرا جگا کر بھائی اپنا — کہا میں نے عجب دیکھا ہوں سپنا
محمد ہور علی ہور باپ میرا — دیکھا جنت مئیں کرتے ہیں پھیرا

مطبوعہ نسخے میں مذکورۂ بالا اشعار اس طرح ہیں۔

بہتر سوتے تھے طفلاں یو سوتا بہار — وہ طفلوں میں ہوا اک طفل بیدار

اُنے دسرا جگا کر بھائی اپنا	کہا میں نے عجب دیکھا ہوں سپنا
محمد اور علی اور باپ میرا	دیکھا جنت منے کرتے ہیں پھیرا

(ولی آبوری: روضۃ الشہدار: بمبئی سلسلہ ۱۳۰ھ ص ۵۲ حاشیہ)

۴۔ **لخلخہ نمبر ۶۱/۱۷**   عطر سازی کے فن کا یہ بہترین نسخہ ہے۔ جسے بحکم نواب میر فرخندہ علی خاں ۱۲۶۵ھ میں حسن مرزا قصدؔ ابن حکیم سلطان مرزا نے لکھا تھا اس کا یہ نام تاریخی ہے جس سے ۱۲۶۵ھ عدد حاصل ہوتے ہیں۔

اس کتاب میں عطر کشید کرنے کے مختلف طریقے مع تصاویر بتائے گئے ہیں۔ جڑی بوٹیوں سے لے کر پھولوں تک سے عطر کشید کرنے کے طریقے اس میں مندرج ہیں۔ فن عطر سازی میں غالباً یہ قدیم ترین نسخہ ہے۔ چونکہ والی حیدرآباد کے نواب کی فرمائش پر یہ نسخہ لکھا گیا تھا اس لیے اس کی کتابت اور اندر کی تصاویر بھی نہایت اہتمام سے بنائی گئی ہیں۔ زیر نظر مخطوطہ فارسی مخطوطہ سے منسلک ہے، قصدؔ نے پہلے فارسی میں اور بعدہٗ اس کا ترجمہ اردو میں کیا تھا۔ دارالمصنفین کے اردو/ فارسی دونوں نسخے فوٹو کاپیز ہیں۔ اصل مخطوطہ وہاں نہیں ہے۔

اس کتاب کی تاریخ تصنیف کے استخراج میں دکن کے کئی شعراء نے طبع آزمائی کی ہے۔ حافظ میر شمس الدین فیض نے درج ذیل اشعار سے مادۂ تاریخ نکالی ہے۔

جب لکھا قصدؔ نے یہ مجموعہ	عیش و عشرت کا سربسر جامع
اس کی تاریخ میں نے لکھی فیضؔ	ہے معطر یہ نسخہ نافع

۱۲۶۵ھ

فن عطر سازی پر ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں مطبوعہ وغیر مطبوعہ کئی کتابیں ملتی ہیں۔ "درج عنبریں" نواب سید کلب علی خاں بہادر والی رام پور کی تالیف ہے۔ اس میں عطر، تیل، اگربتی اور ابٹنا بنانے کے طریقے مندرج ہیں۔ رضا لائبریری کے اس نسخہ میں حاشیہ میں کچھ نسخے بڑھائے گئے ہیں اور ان کے آگے تاریخ بھی درج کر دی گئی ہے۔ "درج عنبریں" میں بعض نسخوں کے نیچے ۱۸۷۵ء اور ۱۸۷۸ء کی تاریخیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ ۱۸۷۵ء سے کچھ قبل لکھا گیا ہوگا۔ عطر سازی پر ایک اور نسخہ "مخزن الشمائم" ۱۲۹۹ھ کا لکھا ہوا رام پور کی لائبریری میں موجود ہے۔ جس کے مصنف نیاز محمد خاں ہیں۔ ان تینوں نسخوں میں قدیم ترین نسخہ دارالمصنفین کا ہے۔ اس نسخہ کی کتابت ۱۲۸۱ھ میں ہوئی تھی۔

۵۔ بھجن واشعار ہندی ۸۱/۸۰۸ (۱۵)

زیر نظر مخطوطہ ہندی کے کسی غیر معروف لیکن کہنہ مشق شاعر رام داس کی رچناؤں کا مجموعہ ہے۔ رام بھکتی پر لکھی گئی ان کویتاؤں کو نرائن لال ولد دلجیت لال نے اپنے ذوق سے جمع کیا تھا۔ ان رچناؤں کا شاعر سمت ۱۹۳۲ء میں اپنے سوامی (گرو) کے ساتھ غازی پور میں رہا کرتا تھا۔ اس کتاب میں رام داس کے بھجنوں کے علاوہ کبیر داس کے دوہے بھی نقل کیے گئے ہیں۔

زیر نظر نسخہ کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ اس میں "ریختہ" کا عنوان دے کر یقینؔ کی غزل (برہمن سے منسوب غزل)، بیگم نواب آصف الدولہ کے دو شعر کے علاوہ چند نامعلوم شعراء کی غزلیں ہیں۔ فارسی میں حافظ کی مشہور

غزل ع "ایں چہ شوریست کہ در دور قمری بینم" بھی درج ہے۔ ریختہ کے عنوان سے
جو غزلیں ہیں ان میں پہلی غزل برہمن سے منسوب مشہور غزل ہے سہ

نہ جانوں کس چمن بھیتر خدانے مجھ کو ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

دوسری غزل نہایت عمدہ ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس کے
شاعر کا سراغ نہیں لگ سکا۔ پوری غزل ملاحظہ ہو:

سنسار موں جس شخص کوں ہر دم خدا کا دھیان ہے
تحقیق کہ جانو سبھی جگ موں وہی انسان ہے

جس کار کوں پیدا ہوا سو تو نہیں کرتا نہ کچھ
کھویا جنم سب کھیل موں کھیل یاں نقصان ہے

ما خلقت الجن والانس واللہ الا تعبدون
جانا کرتا نہ کچھ حق کا جو فرمان بھی ہے

شب رفت در خوابیدگی دن کو نہ کرتا بندگی
کس کام ایسی زندگی، جیوناں نہیں حیوان ہے

رہنا نہیں گھر بار موں اک دن پڑے گا غار موں
جیوناں نہیں سنسار موں، دن دوئی کا مہمان ہے

از غیر حق دیکھو صفا، دنیا کی مت ڈھونڈو وفا
اس میں نہیں ہرگز نفع، آخر سراسر زیان ہے

ہرگز نیابد در جہاں، جن دیکھ ارض الذات ہے
قرآن سوں فارغ ہوا، من کل علیہا فان ہے

راہی سہی کوں تو جان لے تحقیق دل موں مان لے
اسلام کوں پہچان لے یہ دین یہ ایمان ہے

مرشد سوں شئے سب بات لے، نام محمد ساتھ لے
چوگان وحدت ہاتھ لے، یہہ گوئی یہہ میدان ہے

ریختہ (۲)

جن نے صاحب درد کے باتاں کے تئیں جانا نہیں
وہ میری دانست میں ناداں سے داناں نہیں

ذاتِ حق کی جلوہ گر ہے لیکن کوئی طالب نہیں
شمع تو روشن ولے، افسوس پروانہ نہیں

لوگیں کہتے ہیں کہ مجھ کوں اوس پری سیتیں نہ مل
کیوں کر چھوڑدوں اوس پری کوں میں جو دیوانہ نہیں

ہے تمہارے فکر میں اس جھاڑ گل کو دیکھ کر
عندلیباں پھر یئیں اس باغ میں آنا نہیں

وصل گل کی آرزو میں مرگئے، تو شاد ہو
آن پہونچی ہے بہار رو، ہائے دیوانہ نہیں

آج میں وحشی ہوا ہوں، جاں بلب ہوں بے خبر
اب تلک اس شوخ کی اس بات کوں جانا نہیں

دو کتاباں لے بغل میں نام حضرت کا لیا
ہوگئے مشہور لیکن، حرف پہچانا نہیں

مجھ کو وہ نہ ہی ڈراتا اور نہ ہے وہ بے خبر
اب کہیں شاید اوسے دنیا ستیں جاناں نہیں

اس غزل کے نویں شعر کی قرأت نہ ہو سکی۔

شعرہائے یقین

برہمن سر کوں اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے
خدا جانے تیری صورت سوں میخانے پہ کیا گزری

یقیں کب یار میرے نور دل کے درد کوں پوچھے
کہاں ہے شمع کوں پرواہ کہ پروانے پہ کیا گزری

شعر اردو

آراستگی بدن کے تئیں ترک کیجئے ، دنیا ہے جو سراب اسے دل نہ دیجئے
ہوش و ہوس (؟) چھوڑ کے غصہ کو پیجئے ، مغرور ہو کے عیب کسی کا نہ لیجئے

صفحہ ۳۳ ب کی تیسری سطر میں" از بیگم نواب آصف الدولہ،، کی سرخی ڈال کر دو شعر مرقوم ہیں۔ دونوں اشعار کی صحیح قرأت نہ ہو سکی۔

بے طرح جوش جنون ہے ایسی زنجیر کرد ، رام ہو ... دل بھی ایسی تدبیر کرد
مت کرو فکر عمارت ...... زیر فلک ، خانۂ دل کا ...... رہو اسے تعمیر کرد

اس نسخہ کے صفحہ نمبر ۱۵ کے آخر میں ۹ اگست ۱۸۸۶ء تحریر ہے اور صفحہ ۳۰ ب پر نیچے سے پانچویں سطر میں ۹ اکتوبر ۱۸۸۵ء درج ہے۔
اس نسخہ میں ریختہ کے زیر عنوان درج غزلوں کے شاعر کا پتہ چل جائے تو یہ نسخہ بڑا اہم ہو سکتا ہے۔

۶۔ رسالہ فرائض اردو نمبر ۳۴۰/۵۹

یہ منظوم رسالہ ہے، اس میں وراثت کے مسائل کی بالتفصیل تشریح کی گئی ہے۔ بہ اعتبار رشتہ وارثین کی گروہ بندی کی گئی ہے اور پھر ان میں ورثے کی تقسیم کے جزئیات و فروعات بیان کیے گئے ہیں۔ رسالہ کی ابتدا حمد و نعت سے ہوئی ہے۔ عربی فارسی سے ناآشنا لوگوں کے لیے شاعر نے اسے اردو میں پیش کیا ہے۔ اپنی زبان کو وہ ہندی کہتا ہے۔ وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے۔

عربی و فارسی سے جو کوئی آشنا نہ ہو ، ہندی میں اپنے علم فرائض کا اب سنو
(ورق ۱-الف)

زیر نظر مخطوطہ میں حنفی مسلک کے تحت ورثے کی تقسیم کی تفصیل ہے، شاعر نے تقسیم وراثت کے سارے فقہی فروعات کا احصار اس کتاب میں کیا ہے۔ جگہ جگہ احادیث نبویہ اور طریقہ ائمہ و اصول صحابہ کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

شاعر نے اپنا تخلص احمدی لکھا ہے۔ اس کے حالات زندگی کا زیر نظر نسخہ میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ یہ اگرچہ مکمل کتاب ہے لیکن ترقیمہ نہ ہونے کی وجہ سے سنہ تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ خاتمہ کتاب پر دستخط ہے جو پڑھی نہ جا سکی غالباً کاتب کی ہوگی۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

مقدمہ مواریث

میت جو مالدار ہوا و مال اس کا گر ، ہوئے گا زندگی ستیں شرعی رد کا ڈر یہ
مانند کرے اور خیانت کے حق میں دہاں ، جاوے گا مال اوس کا اوسی حق میں بے گماں

پھر ایسے مال بیچ نہ میت کی شان ہے   مفلس کے مال گور و کفن اس کی جان ہے

جو مال بچ رہے گا وصیت کے دینے بعد   تقسیم وارثوں پہ ہے اس مال میں مراد

(ورق الف، ب)

رسالہ کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

حمد خدا و نعت نبی پر دھیان رکھ   صلو علیہ امر جو ہے اوس پر جان رکھ

کہتا ہے احمدی کہ فرائض کا علم جان   احسان اوس کریم کا اوس علم میں پہچان

احمدی تخلص کے شاعر کے بارے میں تذکرۂ چمنستان شعراء از لالہ لچھمی نرائن شفیق اور میر کے "نکات الشعراء" میں معلومات ملتی ہیں۔ شفیق رقمطراز ہیں:

" شاعر عالی مقام و معنی پژوہ قدیم الایام است سخن را بطرز قدیم گفتہ و گوہر ہستی او راجوئی تقدیر در رشتہ گجرات سفتہ است۔ این بیت طبع زادش میر تقی میر می نویسد:"

ہے نادر خیالاں میں ملے شوریدہ حالاں میں :: ہوئے صاحب کمالاں میں کدھر آکر کدھر نکلے

میر نے اپنے تذکرے میں یہ پوری غزل درج کی ہے۔ سید ظہیر الدین مدنی نے اپنی تصنیف سخنوران گجرات کے صفحہ ۱۱۱ پر مخزن شعراء کے حوالے سے احمدی کی مذکورہ بالا پوری غزل درج کی ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے نکات الشعراء کو ترتیب دیتے وقت فٹ نوٹ میں قائم ہشوق اور میر حسن کے حوالوں سے احمدی کو احمد ہی لکھا ہے۔ بہر حال یہ اگر وہی احمدی ہیں جن کا شعر اوپر درج ہوا ہے تو پھر زیر نظر نسخہ "رسالہ فرائض" کو ان سے منسوب کرنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ غزل و نسخہ کے املا اور زبان میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ عمل اگرچہ اصول تحقیق کے خلاف ہے لیکن دوسرے شواہد جب تک نہ ملتے ہوں۔ "رسالہ فرائض" کو احمدی گجراتی کی تصنیف قیاس کرنے میں کوئی قباحت نہ ہونی چاہیے۔

اسلامی فرائض جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ پر گو بہت ساری منظوم کتابیں مل جاتی ہیں، لیکن مسئلہ وراثت پر یہ اپنی نوع کا غالباً پہلا نسخہ ہے۔ سالار جنگ میوزیم، آرکائیوز حیدرآباد، آصفیہ کتب خانہ، ادارۂ ادبیات اردو، رضا لائبریری اور خدا بخش کتب خانے کی فہارس مخطوطات میں اس کتاب کا نام نہیں ملتا، اس اعتبار سے دار المصنفین کے نسخہ کی قدر بڑھ جاتی ہے۔

۷۔ **معرفۃ القلوب/ قرآن العارفین نمبر ۲۹۷/۶**

یہ نسخہ نہایت کرم خوردہ لیکن قدیم نثر کا عمدہ نمونہ ہے۔ شرف الدین حاتم معشوق نے اسے لکھا ہے۔ زبان اس رسالے کی گیارہویں صدی ہجری کی محسوس ہوتی ہے۔ عبارت مقفع و مسجع ہے۔ شرف الدین نامی کسی بزرگ نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی تعلیمات اپنے مریدین کو سمجھانے کے لیے دکنی میں اسے مرتب کیا ہے۔ دکن میں شرف الدین نامی کئی بزرگ ملتے ہیں اور سب کا تعلق گیسو دراز کے سلسلۂ بیعت سے رہا ہے۔ اس لیے اصل مصنف کی نشاندہی مشکل امر ہے۔

مصنف نے اپنے مریدوں کو معشوق اللہ کہہ کر مخاطب کیا ہے جس کی وجہ سے وضاحتی فہرست میں مصنف کا نام "معشوق اللہ" بتایا گیا ہے۔ یہ نسخہ ناقص الآخر ہے اس لیے ترقیمہ وغیرہ نہیں ہے، ہاں ایک جگہ ۱۲۳۶ھ

سنہ درج ہے، جو غالباً سنہ کتابت ہوگا۔ طرز و اسلوب اس نسخہ کا ذیل کے مانند ہے:

" وہی جیکچھ بولیا ہوں سو خوشبوئی رو لیا ہوں کلمہ طیب کا بیان کھولیا ہوں کلمہ طیب صورت سوں ہے۔ قرآن اس کا کوٹ ہے۔ بغیر صورت کوٹ کیا کام آوے، صورت سوں صورت ہے کوٹ سوں کوٹ ہے":

مصنف نے صوفیانہ نکات کی تشریح بڑے ماہرانہ انداز میں کی ہے کہتے ہیں:

" معشوق اللہ! سنو ہور خاطر لیاؤ۔ یں توں ثابت کرنا سو شریعت ہے۔ اپستی نکلنا سو طریقت ہے، کمان سوں گذرنا حقیقت ہے۔ حق سوں حق دیکھنا سو معرفت ہے۔ حق سوں حق ہونا وحدۃ ہے۔ حضرت بندگی مخدوم سید محمد حسنی گیسو دراز سوں سنو:...."

اس طرح پوری کتاب میں سالکان تشنہ کام کو درس سلوک دیا گیا ہے۔

۸۔ پشپ نامہ یعنی بیناولی (ناماولی) چار جگ نمبر ۹۰

برادران وطن کے نظریہ تمدن انسانی کے تحت چار یگوں میں پیدا ہوئے دیوتاؤں اور انسانوں کا یہ شجرہ ہے۔ اس کے آخری سرے پر محمد غوری اور پرتھوی راج کے نام ملتے ہیں یہ عجیب و غریب شجرہ یوں شروع ہوتا ہے:

" اول ست۔ اور ست کا لڑکا دھرم اور دھرم کا لڑکا کورم اور کورم کا لڑکا ادھ دھیانی، ادھ نرائن، ادھ نرائن کا لڑکا مول نرائن...."

یہ شجرہ صرف قیاس پر ترتیب دیا گیا ہے اور ہندو۔ مسلم سلاطین کو ایک دوسرے کی اولاد سے خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ طرفہ یہ کہ محمد غوری اور پرتھوی راج اس شجرے میں ایک دوسرے کے بھائی بتائے گئے ہیں۔ ایک حق کا پرستار اور

دوسرا باطل کا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس شجرے کے مرتب کا پتہ نہیں چل سکا۔ ویسے یہ کتاب غیر اہم بھی ہے۔

دارالمصنفین کے ان اردو مخطوطات کے علاوہ فارسی مخطوطات کی فہرست میں شاہ برہان الدین جانم کی "کلمۃ الحقایق" بھی ہے جو قدیم اردو نثر میں جانم کی لکھی ہوئی نہایت اہم کتاب شمار ہوتی ہے۔ اسی نسخہ کے ساتھ "مخزن السالکین" ساٹھ صفحات پر مشتمل ایک اور رسالہ ہے۔ دارالمصنفین کے تعارفی کتابچہ میں اسکا مصنف جانم ہی کو قرار دیا ہے۔ لیکن تا حال کسی محقق نے برہان الدین جانم کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ اگر تحقیق سے یہ کتاب جانم کی ثابت ہو جاتی ہے تو ان کی تصانیف میں ایک اور کتاب کا اضافہ ہو جائے گا، جس کا صرف ایک ہی نسخہ یہاں محفوظ ہے۔

اسی طرح مذکورہ تعارفی کتابچہ میں صفحہ ۳۹ پر "معرفتہ السلوک" کو "شیخ محمد چشتی" کی تصنیف قرار دیا گیا ہے، جبکہ اس کے مصنف شیخ محمود خوش دہاں ہیں۔ (دیکھئے تاریخ ادب اردو جمیل جالبی، جلد اول ص ۳۰۶)

مطبوعات جدیدہ

پرانے چراغ حصہ سوم از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۶۰ روپے، پتہ: مکتبہ فردوس، مکارم نگر (برولیا) لکھنؤ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے پرانے چراغ کے نام سے جو سلسلۂ تصنیف شروع کیا ہے، اس میں ان کے عہد کے کسی شعبہ میں ممتاز یا کسی خاص حیثیت سے اہمیت رکھنے والے اُن اشخاص کے محاسن و کمالات کا ذکر ہوتا ہے جن سے مصنف کو گہرا تعلق اور زیادہ قربت و یگانگت رہی ہے، اس سلسلہ کے دو حصوں کا ذکر ان صفحات میں ہو چکا ہے، زیر نظر تیسرے حصہ میں ۲۳ حضرات کی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں اور ان کے وہبی کمالات اور مخصوص امتیازات کے متعلق تاثرات و مشاہدات سپرد قلم کیے گیے ہیں، یہ چھ حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں چار عرب فضلا شیخ حسن البنا، سید قطب شہید، شیخ محمد صالح قزاز اور شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کی دینی و دعوتی خدمات، علمی کمالات اور سیرت و اخلاق کے بارے میں نقوش و تاثرات پیش کیے گئے ہیں۔ دوسرے حصہ میں نامور داعی و مبلغ مولانا محمد یوسف کاندھلوی اور مشہور عارف باللہ مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی کی یگانہ خصوصیات اور اصلاح و ارشاد میں انکی مساعی جمیلہ کا تذکرہ ہے، تیسرے حصہ میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا منت اللہ رحمانی اور جنرل

ضیاء الحق کے اوصاف و کمالات اور مجاہدانہ خدمات کا حال بیان کیا ہے، چوتھے حصہ میں مولانا قاری محمد طیب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا نسیم احمد فریدی کی سیرت و شخصیت کی دل آویزی اور ان کی علمی دینی و اصلاحی خدمات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، پانچویں حصہ میں دین و ملت کے اُن خدام و کارکنان کے اوصاف و محامد بیان کیے گئے ہیں جو مولانا کے بے تکلف دوست یا رفیق خاص تھے، یعنی سید محمد جمیل صاحب، حاجی عبدالرشید ارشد صاحب، مولانا عبیداللہ بلیاوی، ڈاکٹر آصف قدوائی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، حکیم عبدالقوی دریابادی، مولانا محب اللہ لاری، مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی۔ مصنف کا یہ امتیاز بھی ہے کہ انھوں نے اس سلسلۂ تصنیف میں اپنے بزرگ اور ہم پایہ معاصرین کے علاوہ اپنے خوردوں اور نیازمندوں کو بھی جگہ دی ہے، وانّ کُلّ ذِی فَضْلٍ فَضْلَہٗ، کتاب کے آخر میں اپنے دو ہم خاندان سید احمد حسنی اور مولانا محمد ثانی حسنی اور دو ندوی عزیزوں مولانا ابوالعرفان ندوی اور مولوی عبدالنور کی امتیازی صلاحیتوں اور خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے کلک گہربار سے ایسے منفرد و یگانہ اشخاص کا تذکرہ نظیری کا یہ شعر یاد دلاتا ہے

داستان عہد گل را از نظیری باز پرس　　عندلیب آشفتہ تر گفت است ازیں افسانہ را

یہ کتاب جن لوگوں کے حالات و واقعات کا مرقع ہے، گزشتہ کئی برسوں سے قومی و ملی زندگی میں ان کا غیر معمولی حصہ رہا ہے، اس لحاظ سے یہ اس عہد کے واقعات و حالات کے لیے ایک دستاویز ہے۔

اضواء (عربی) از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت

وطباعت اچھی، صفحات ۵۸، قیمت درج نہیں، پتہ: المطبعۃ الندویہ، ندوۃ العلماء،
پوسٹ باکس نمبر ۹۳، لکھنؤ۔

ہندوستان ابتدا ہی سے شرک و بت پرستی کا بڑا مرکز تھا جس کے اثرات یہاں
کے مسلمانوں پر بھی پڑے، اس مختصر رسالہ میں ہندوستان کی اُن دینی و اصلاحی تحریکوں
اور اداروں کا ذکر ہے جنھوں نے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی اور انہیں
کفر و بدعت اور دیو مالائی تصورات و خرافات سے محفوظ رکھا، پہلے حضرت شیخ احمد
سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے اصلاحی و تجدیدی کارنامے بیان کیے گئے ہیں،
پھر ولی اللّٰہی تحریک اور حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نیز دیوبند
سہارن پور کے مدارس اور ندوۃ العلماء کی تحریک اور ان کے اہم افراد کی اصلاحی
سرگرمیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور آخر میں تبلیغی جماعت کے مسلمانوں میں ایمان و
یقین کی روح پھونکنے اور بے لوث اصلاحی و دینی خدمت انجام دینے کا ذکر ہے،
مصنف نے اس دینی تحریک کی مخالفت کرنے والوں کی سخت شناعت بیان کی
ہے، گویا یہ رسالہ ایک مخصوص حلقہ کی طرف سے حضرات شہیدین اور جماعت تبلیغ
کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا مدلل جواب ہے، اس میں مولانا سید نذیر
حسین محدث اور جمعیۃ اہل حدیث کا ذکر کرنا بھی مناسب تھا جو ابتدا میں توحید
خالص اور اصلاح عقائد کی تحریک تھی۔

دلی کی تاریخی مساجد جلد اول مرتبہ مولانا عطاء الرحمن قاسمی تقطیع
متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۳۵۲، مجلد مع خوبصورت گردپوش،
قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: (۱) مولانا آزاد اکیڈمی، ۳۴ ابوالفضل انکلیو، اوکھلا،

نئی دہلی ۲۵ (۲) مولانا آزاد اکیڈمی ۱۹۳ گلی گڑھیا بازار، مٹیا محل، جامع مسجد
دہلی ۶۔

مولانا عطاء الرحمن قاسمی کا درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا بھی مشغلہ
ہے، ان کی قلمی جولانیوں کا خاص محور اسلامی یادگاروں کا تحفظ اور مسلمانوں کی عظمت
رفتہ کے نقوش کو ضائع ہونے سے بچانا ہے، اس سے پہلے ان کی مفید کتاب
الواح الصنادید کے دو حصے چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں، اب انھوں نے ہندوستان
کی تاریخی مساجد پر سلسلہ تالیف شروع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، جس کی ابتدا
دلی کی تاریخی مساجد سے کی گئی ہے، دلی عالم میں انتخاب شہر تھا جو مملوک و تیموری
سلاطین کا دار السلطنت اور صدیوں اسلامی شان و شوکت کا مرکز رہا ہے،
۱۹۹۲ء کے سروے کے مطابق یہاں دو ہزار مسجدیں تھیں، ان میں سے تقریباً
ساٹھ اہم اور تاریخی مسجدوں کے بارے میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کب تعمیر ہوئیں،
تعمیر کرنے والے کا نام اور حالات کیا تھے، فنِ تعمیر اور دوسرے پہلوؤں سے
ان میں کیا خوبیاں تھیں؟ دروازوں، گنبدوں، میناروں، برجیوں، زینوں،
حوض اور صحن وغیرہ کی تعداد، اونچائی، لمبائی، چوڑائی کتنی ہے، ان کا جائے وقوع،
رقبہ اور خسرہ نمبر کیا ہے؟ کن مسجدوں پر غاصبانہ قبضہ ہو چکا ہے اور کون سی
محکمہ آثار قدیمہ کے زیر سایہ برباد ہو رہی ہیں، کتنی کسٹوڈین کی مہربانی سے رہائش
گاہوں میں تبدیل ہو گئی ہیں؟ کون سی مسجدیں دلی وقف بورڈ کے زیر اہتمام
اور کون سی مسلمانوں کے زیر اہتمام ہیں، غرض مسجدوں کی گزشتہ اور موجودہ
حالت مستند حوالوں سے بیان کی گئی ہے، آخر میں دو فہرستیں ہیں، ایک میں

پارلیمنٹ کے رکارڈ کے مطابق دہلی کی ان ۹۲ مسجدوں کے نام مع پتہ دیا ہے، جن پر ۴۷ء کے بعد ناجائز قبضہ ہوگیا ہے، دوسری راجیہ سبھا کے حوالے سے صوبہ وار ۲۶۶ مسجدوں کی فہرست ہے، جن کے بارے میں یہ صراحت بھی کردی گئی ہے کہ وہ آباد ہیں یا غیر آباد۔ شروع کا مقدمہ بھی جامع اور پُر از معلومات ہے، اس میں اور کتاب میں بھی جابجا آزاد ہندوستان میں مسجدوں کی ویرانی و بربادی کا جو دردانگیز نقشہ کھینچا گیا ہے، وہ سیکولر ہندوستان کے لیے نہایت باعث شرم اور مسلمانوں کے لیے درس عبرت سے کم نہیں، اللہ تعالیٰ مصنف کی محنت و تحقیق کا صلہ دے اور کتاب کو شرف قبولیت بخشے۔

اخلاقیات طبیب از حکیم محمد سعید، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۲، مع خوبصورت و مصور ڈسٹ کور، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: بیت الحکمہ۔ شارع مدینۃ الحکمہ کراچی۔ پاکستان۔

حکیم محمد سعید صاحب ایک حاذق و ماہر طبیب ہی نہیں ہیں بلکہ دین و روحانیت کی اعلیٰ اقدار سے مرصع اور اخلاق کی بلند ترین صفات کے حامل بھی ہیں، انکے نزدیک فن طب انسان کی اصلاح و فلاح اور خدمت و راحت کا وسیلہ ہے، جس کی اصل بنیاد اخلاق ہے، اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ طبیب کو کن اوصاف کا حامل ہونا چاہیے اور مریضوں کے ساتھ اس کا رویہ اور برتاؤ کیسا ہونا چاہیے، حکیم صاحب کا اولین درس اخلاق یہ ہے کہ طبیب کو اپنے عجز و قصور کا اعتراف اور اللہ تعالیٰ کے شافی مطلق ہونے کا احساس ہونا چاہیے، یہ کتاب ہر طبیب و ڈاکٹر کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے تاکہ اس فن شریف میں بے راہ روی کے فروغ سے جو مضرتیں اور خرابیاں پیدا ہورہی ہیں انکا تدارک ہوسکے۔

"ض"

دار المصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعر العجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت۔ ۴۰ روپے

شعر العجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت۔ ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت۔ ۲۵ روپے

شعر العجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت۔ ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ۔ قیمت۔ ۳۰ روپے

انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۲۵ روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت۔ ۲۵ روپے

گل رعنا: (مولانا عبدالحیٔ مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت۔ ۶۰ روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت۔ ۶۰ روپے

شعر الہند حصہ اول: (مولانا عبدالسلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ۔

شعر الہند حصہ دوم: (مولانا عبدالسلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت۔ ۵۰ روپے

اقبال کامل: (مولانا عبدالسلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی نظریہ ملت، تعلیم سیاست صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت۔ ۴۰ روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتدا سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت۔ ۷۵ روپے